سلسلۂ اشاعتِ تنظیمِ اسلامی نمبر ۷

تنظیم اسلامی

کی

دعوت

ڈاکٹر اسرار احمد

بانیٔ تنظیم اسلامی

مکتبہ خدام القرآن لاھور

36۔کے ماڈل ٹاؤن لاہور۔فون:3-35869501

www.tanzeem.org

تنظیمِ اسلامی

کی اساسی دعوت

تجدید ایمان | توبہ | تجدید عہد

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ
وَالْكِتٰبِ الَّذِیْ نَزَّلَ عَلٰی رَسُوْلِهٖ﴾

(النساء:۱۳۶)

﴿یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا تُوْبُوْٓا اِلَی اللّٰهِ تَوْبَةً نَّصُوْحًا﴾

(التحریم:۸)

﴿وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَیْكُمْ وَمِیْثَاقَهُ الَّذِیْ
وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا﴾

(المائدہ:۷)

﴿وَاَوْفُوْا بِعَهْدِیْٓ اُوْفِ بِعَهْدِكُمْ وَاِیَّایَ فَارْهَبُوْنِ﴾

(البقرہ:۴۰)

فہرست

☆ بانی تنظیم اسلامی کا ذہنی و فکری پس منظر 5

☆ تنظیم اسلامی کے قیام کے محرکات 9

☆ **ہمارے دینی فرائض** 13

(۱) بندگیٔ رب 13

فرض عبادات کا بندگیٔ رب سے تعلق 16

(۲) دعوت و تبلیغ 17

دعوت و تبلیغ کا ختم نبوت سے تعلق 18

امت مسلمہ کی غرض تاسیس 20

دعوت و تبلیغ کا مرکز و محور 21

(۳) اقامت دین 23

اسلام ''مذہب'' کیسے بنا؟ 23

یہ شہادت گہہ الفت میں قدم رکھنا ہے 24

عملی نمونے کی ضرورت 27

اقامت دین کے دو ناگزیر لوازم 28

☆ **اقامت دین کی جدوجہد کا طریقہ کار** 36

انتخابی طریقہ کار 36

دعوت و تبلیغ 38

☆ **موجودہ حالات میں اسلامی انقلاب کے لئے اقدام کی صورت** 41

اقامت دین کی جدوجہد کے نتائج 46

(۱) فلاحِ آخرت 46

(۲) غلبۂ اسلام کا امکان 47

(۳) پاکستان کی بقاوسالمیت 50

بانی تنظیم اسلامی محترم ڈاکٹر اسرار احمد حفظہ اللہ کا ایک نہایت جامع خطاب جو آپ نے امیر تنظیم اسلامی کی حیثیت سے تنظیم اسلامی حلقہ لاہور کے زیر اہتمام منعقدہ اجتماع سے فرمایا۔ یہ اجتماع ۲۵/ دسمبر ۱۹۹۴ء کو قرآن آڈیٹوریم لاہور میں ہوا۔ سامعین میں رفقاء تنظیم اسلامی لاہور کے اعزہ و احباب کی ایک بڑی تعداد بھی شامل تھی‘ جنہیں بطور خاص اس تقریب میں مدعو کیا گیا تھا۔

خطبۂ مسنونہ کے بعد:

اَعُوذ باللّٰہ مِنَ الشیطٰن الرَّجیم۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحمٰن الرَّحیم

﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ ۣ عَلٰي بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ ۭ وَسُبْحٰنَ اللّٰهِ وَمَآ اَنَا مِنَ الْمُشْرِكِيْنَ ۱۰۸﴾ (یوسف) ...... صدق اللہ العظیم

معزز حضرات اور محترم خواتین!

اِس وقت جو حضرات یہاں جمع ہیں ان میں دو قسم کے لوگ ہیں۔ ایک تو وہ ہیں جو پہلے سے تنظیم اسلامی کے قافلے میں شریک ہیں اور دوسرے وہ حضرات ہیں جنہیں تنظیم اسلامی میں پہلے سے شامل افراد نے اپنے احباب اور اعزہ و اقارب میں سے خصوصی دعوت دے کر یہاں بلایا ہے تا کہ ان کے سامنے تنظیم کا پیغام رکھا جا سکے اور اس طرح ان کو تنظیم میں شمولیت کی دعوت دی جائے۔ ظاہر بات ہے کہ اِس وقت میرے اصل مخاطب دوسری قسم کے حضرات ہیں۔ جو حضرات پہلے سے تنظیم میں شامل ہیں وہ تو کسی نہ کسی درجے میں تنظیم اسلامی کے پیغام‘ اس کی دعوت‘ اس کے پروگرام اور اس کے اغراض و مقاصد سے نہ صرف واقف ہیں بلکہ متفق ہیں اور اس حد تک متفق ہیں کہ انہوں نے اپنے وقت‘ اپنی صلاحیتوں‘ اپنے وسائل اور اپنی توانائیوں کا کچھ حصہ اس کے لیے وقف کیا ہے۔ اگرچہ شعور کے مختلف درجے اور فہم کے مختلف مراحل ہیں‘ چنانچہ کسی کے سامنے یہ بات بہت واضح ہے اور کسی کے سامنے اس کا نقشہ اجمالاً موجود ہے‘ لیکن بہرحال وہ سب حضرات اس سے کسی نہ کسی درجے میں واقف ہیں۔ لہٰذا اِس وقت میرا

اصل خطاب ان سے نہیں ہے‘ بلکہ میرا روئے سخن ان حضرات کی طرف ہے کہ جنہیں آج خاص طور پر دعوت دی گئی ہے اور وہ یہاں اس لیے تشریف لائے ہیں کہ سمجھیں کہ تنظیم اسلامی کیا ہے‘ اس کے اغراض و مقاصد کیا ہیں‘ اور اس کا طریقہ کار کیا ہے‘ تاکہ اگر ان کے دل و دماغ گواہی دیں کہ بات صحیح ہے تو وہ اس میں شمولیت کا فیصلہ کریں۔ تنظیم میں پہلے سے شامل حضرات کے لیے یہ ایک طرح کی تذکیر اور یاد دہانی ہوگی۔

امیر تنظیم کا ذہنی و فکری پس منظر

تنظیم اسلامی اس اعتبار سے ایک بالکل منفرد قسم کی تنظیم ہے کہ اس میں شمولیت کا ذریعہ ایک شخص (امیر تنظیم) سے بیعت ہے اور اس بنیاد پر غالباً کوئی دوسری جماعت یا تنظیم اِس وقت کم از کم پاکستان میں موجود نہیں۔ اس حوالے سے چونکہ اس تنظیم میں شمولیت کا راستہ ذاتی طور پر امیر تنظیم سے بیعتِ سمع و طاعت فی المعروف میں منسلک ہونے کا راستہ ہے‘ لہٰذا مجھے اپنی گفتگو میں یہ ترتیب قائم کرنی پڑی ہے کہ پہلے میں آپ حضرات کو یہ بتلاؤں کہ ذاتی طور پر میرا وہ کیا ذہنی و فکری پس منظر ہے اور ذاتی طور پر میرے لیے وہ کیا محرکات تھے جن کے تحت میں نے یہ تنظیم قائم کی۔ پہلی بات کے ضمن میں صرف دو باتیں کفایت کریں گی۔ اگرچہ انسانی زندگی ایک بڑا طویل عمل ہے‘ بقول علامہ اقبالؔ: ؎

تو اسے پیمانۂ امروز و فردا سے نہ ناپ
جاوداں‘ پیہم دواں‘ ہر دم جواں ہے زندگی!

تاہم عام طور پر جسے ہم ”زندگی“ کہتے ہیں‘ یعنی دنیوی زندگی‘ اس کا تریسٹھواں برس بھی اب قریب الاختتام ہے۔ اس طویل عرصے کے دوران میں نے بہت کچھ پڑھا بھی ہے‘ سنا بھی ہے اور غور و فکر بھی کیا ہے۔ نیز مختلف اَطراف و جوانب سے ذہن و فکر اور شعور پر اثرات بھی وارد ہوئے ہیں۔ اس کی تفصیل تو ظاہر ہے اِس وقت بیان نہیں کی جاسکتی‘ لیکن مختصراً میں یہ کہہ سکتا ہوں کہ میری فکر‘ میری سوچ اور میرے نقطۂ نظر کے متعین ہونے میں دو اہم ترین عوامل تھے۔ بالکل اوائل عمر یعنی بچپن ہی میں مَیں جس چیز سے سب سے

زیادہ متاثر ہوا تھا وہ علامہ اقبال کی ملّی شاعری تھی۔ یوں سمجھئے کہ یہ چالیس کی دہائی کے ابتدائی سال تھے‘ جبکہ میری پیدائش ۱۹۳۲ء کی ہے۔ میں اپنی پانچویں جماعت ہی کے زمانے سے ”بانگِ درا“ پڑھتا رہا ہوں اور اس میں جو ایک ملی جذبہ ہے‘ اس نے میرے قلب و ذہن پر گہرے اثرات مرتب کیے ہیں۔ یہ وہ وقت تھا جب امّتِ مسلمہ اپنے زوال کی انتہا کو پہنچ چکی تھی‘ اُس وقت پوری دنیا میں تمام مسلمان ممالک غلام بنائے جا چکے تھے‘ عظیم سلطنتِ عثمانیہ کو ختم ہوئے ربع صدی کے قریب بیت چکی تھی‘ خلافت کا خاتمہ ہوئے سترہ اٹھارہ برس بیت چکے تھے اور اِس طرح پوری دنیا میں مسلمانوں کے ملی اتحاد کا جو ایک نشان یا علامت تھی وہ بھی ختم ہو چکی تھی۔ اسی نقشہ کے پس منظر میں مولانا حالؔی نے یہ اشعار کہے تھے: ؎

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے
اسلام کا گر کر نہ ابھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد
دریا کا ہمارے جو اترنا دیکھے

اس مایوسی کی فضا میں علامہ اقبال نے ملتِ اسلامیہ کو ایک امید افزا پیغام دیا: ؎

سرشک چشم مسلم میں ہے نیساں کا اثر پیدا
خلیل اللہؑ کے دریا میں ہوں گے پھر گہر پیدا
کتابِ ملّتِ بیضا کی پھر شیرازہ بندی ہے
یہ شاخِ ہاشمی کرنے کو ہے پھر برگ و بر پیدا!
نوا پیرا ہو اے بلبل کہ ہو تیرے ترنّم سے
کبوتر کے تنِ نازک میں شاہیں کا جگر پیدا

اور ؎

سبق پھر پڑھ صداقت کا‘ عدالت کا‘ شجاعت کا
لیا جائے گا تجھ سے کام دنیا کی امامت کا!

میں صرف مثال کے طور پر یہ چند اشعار آپ کے سامنے رکھ رہا ہوں۔ یہ وہ کیفیات اور اثرات تھے جن میں میرا ہائی سکول کا ابتدائی زمانہ گزرا۔ یہی وجہ ہے کہ میں تحریک پاکستان، جو اُس وقت اپنے شباب اور عروج پر تھی، اس کے ایک ادنیٰ کارکن کی حیثیت سے مسلم اسٹوڈنٹ فیڈریشن میں شامل ہو کر کام کرتا رہا۔ ۱۹۴۷ء میں مَیں نے میٹرک کا امتحان پاس کیا اور اس کے فوراً بعد، محض استعارے کے طور پر نہیں بلکہ واقعتاً، آگ اور خون کے دریا عبور کر کے پاکستان حاضری ہوئی۔ ہم نے ۱۷۰ میل کا فاصلہ پیدل قافلہ کے ساتھ بیس دن میں طے کیا جن میں ہم ہر لحظہ زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب تھے۔ بہر حال اللہ نے ہمیں ہمارے خوابوں کی سرزمین پاکستان میں پہنچا دیا۔

جس نعرہ کے تحت یہ ملک حاصل کیا گیا تھا اس کے لیے یہاں پر ایک عملی جدوجہد کے لیے جماعت اسلامی سامنے آئی۔ مولانا مودودی اسلامی دستور کا مطالبہ لے کر سامنے آئے تو فطری طور پر اس کی طرف توجہ ہوئی۔ پھر اس کے بعد طالب علمی کا بقیہ سارا زمانہ، یعنی ایف ایس سی کے دو سال جو کہ گورنمنٹ کالج میں بسر ہوئے اور ایم بی بی ایس کے پانچ سال جو کنگ ایڈورڈ میڈیکل کالج میں بیتے، اسلامی جمعیت طلبہ کے ساتھ ایک فعال انداز میں گزرا۔ اس کے بعد جماعت اسلامی میں شمولیت اختیار کی۔ چنانچہ میرے ذہن وفکر اور میری سوچ پر دوسری بڑی چھاپ مولانا مودودی کی ہے، جن کے فکر کے دو پہلو میرے سامنے بہت واضح ہو کر آئے۔ ان میں سے ایک بات اگرچہ علامہ اقبال کے کلام سے بھی واضح ہو چکی تھی لیکن علامہ اقبال سے جو خاکہ بنا تھا اس میں تفصیل کا رنگ مولانا مودودی کی کتابوں نے بھرا۔ اور وہ یہ کہ اسلام ایک مذہب نہیں، دین ہے۔ یہ ایک مکمل نظامِ زندگی ہے، یہ اپنا غلبہ چاہتا ہے، یہ مغلوب ہونے کے لیے نہیں آیا، اَلحَقُّ یَعْلُو وَلَا یُعْلٰی عَلَیه۔ حق کا تو یہ حق ہے کہ وہ غالب ہو، سربلند ہو، نہ یہ کہ وہ مغلوب اور پامال ہو۔ اس کے علاوہ دوسرا پہلو فرائضِ دینی کے حوالے سے سامنے آیا، یعنی فرائض دینی صرف نماز، روزہ، حج اور زکوٰۃ ہی نہیں ہیں بلکہ اس سے بڑھ کر آگے بھی ہیں۔ چنانچہ خود دین کا ایک ہمہ گیر تصور اور پھر فرائض دینی کا ایک جامع تصور، یہ دو چیزیں ہیں جو

مولانا مودودی کی تصانیف سے میرے سامنے آئیں اور جس کا بحمد اللہ آج بھی اقرار کر رہا ہوں۔ بعد میں مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سے دیگر حضرات کی تحریریں بھی پڑھیں۔ پھر خود جس قدر قرآن حکیم کا مطالعہ کیا اس سے اس فکر میں مزید پختگی پیدا ہوئی، گہرائی و گیرائی میں اضافہ ہوا اور اس پر اعتماد و وثوق بڑھتا چلا گیا۔ لہٰذا میں نے جو کچھ بھی کام شروع کیے وہ درحقیقت اسی ذہنی وفکری پس منظر کے زیر اثر کیے۔

میرے اس ذہنی وفکری پس منظر کے اہم لینڈ مارکس بھی نوٹ کر لیجیے۔ ۱۹۴۷ء میں پاکستان آنا ہوا تھا۔ ۱۹۵۴ء میں ایم بی بی ایس کرنے کے بعد میں منٹگمری (ساہیوال) چلا گیا تھا، جہاں والدین مقیم تھے۔ ۱۹۶۵ء میں مَیں پھر اس عزم کے ساتھ واپس لاہور آیا کہ اب اپنے آپ کو اسی جدوجہد کے لیے ہمہ تن لگا دوں گا۔ ۱۹۶۵ء سے لے کر ۱۹۷۲ء تک سات سال میں نے تن تنہا کام کیا ہے۔ اس عرصے کے پہلے پانچ سال تو کچھ جزوی اعتبار سے پریکٹس بھی کرتا رہا لیکن فروری ۱۹۷۱ء میں حج کے موقع پر میں نے پریکٹس کو بالکل تج دیا اور اپنے آپ کو ہمہ وقت و ہمہ تن اپنے اس مشن کے لیے فارغ کر لیا۔ چنانچہ فروری ۱۹۷۱ء کے بعد سے آج تک میں نے اپنی کسی توانائی اور وقت کا کوئی حصہ دنیوی معاش کے لیے صَرف نہیں کیا، بلکہ میرے وقت کا ایک ایک لمحہ اور میری قوت وصلاحیت کا ایک ایک شمہ اسی مشن کے لیے صَرف ہوا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے، جس کا یہ قاعدہ اور قانون ہے کہ محنت کی جائے تو اس کے نتائج نکلتے ہیں، ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آیا۔ اس کے تحت پہلے قرآن اکیڈمی قائم ہوئی، پھر یہ قرآن کالج بنا جس کے سر پر یہ قرآن آڈیٹوریم کا تاج رکھا ہوا ہے جس میں ہم اِس وقت بیٹھے ہوئے ہیں۔ ۱۹۷۵ء میں تنظیم اسلامی قائم ہوئی۔ اس سے قبل اگست ۱۹۷۴ء میں میں نے ایک تقریر کی تھی جس میں تنظیم کے قیام کے فیصلے کا اعلان کیا تھا۔ یہ تقریر اب ''عزمِ تنظیم'' کے نام سے چھپی ہوئی موجود ہے، جو حضرات بھی تنظیم کے قیام کا پس منظر، جو میں نے ابھی مختصراً بیان کیا ہے، اس کو ذرا تفصیل میں جاننا چاہتے ہوں وہ میرے اس کتابچے کا مطالعہ کر سکتے ہیں۔ بہر حال میں آپ کو بتا دینا چاہتا

ہوں کہ ۱۹۷۱ء سے لے کر اب تک بحمد اللہ میرے وقت اور میری صلاحیت کا کوئی حصہ دنیا کمانے یا دنیا بنانے میں صرف نہیں ہوا۔ چنانچہ میں نے حال ہی میں اس ضمن میں ایک تحریر ''حسابِ کم وبیش'' کے نام سے کتابچے کی شکل میں لکھی ہے۔ اپنے اس مشن کے آغاز اور تنظیم اسلامی کے قیام سے قبل میرے پاس اِس پوری دنیا میں واحد جائیداد کرشن نگر میں ایک مکان تھا۔ اسی کو بیچ کر میں نے ماڈل ٹاؤن میں ایک مکان بنایا ہے۔ اس کے علاوہ اس پوری دنیا میں نہ میری کوئی جائیداد ہے نہ کوئی بینک بیلنس ہے۔ ایک کرنٹ اکاؤنٹ ضرور ہے جس میں شاید چار پانچ ہزار روپے پڑے ہوں۔ نہ میرے پاس کوئی بانڈز ہیں' نہ میرا کسی فرم میں کوئی حصہ ہے' نہ میرے پاس کوئی شیئرز ہیں۔ میری کُل کائنات اِس زمین پر اس آسمان کے نیچے' جسے دنیوی اعتبار سے جائیداد کہا جا سکتا ہے یہی ایک مکان ہے اور وہ بھی میں اپنے بچوں کو دے چکا ہوں۔

تنظیم کے قیام کے محرکات

اب میں اپنے اسی پس منظر کے دوسرے پہلو کی طرف آ رہا ہوں کہ یہ کام میں نے کیوں کیا ہے! اس ضمن میں' جیسا کہ ہمارے دین کا ایک عام اسلوب ہے کہ پہلے نفی اور پھر اثبات (لَا اِلٰہَ اِلاَّ اللّٰہ)' میں آپ کے سامنے اس کے منفی اور مثبت دونوں پہلو رکھ رہا ہوں۔ پہلی بات یہ کہ اس سے میرے پیش نظر کسی درجے میں بھی سیاست کا کھیل ہرگز نہیں ہے۔ یہاں ''سیاست'' سے میری مراد مروّجہ اور معروف معنوں میں سیاست ہے' یعنی اقتدار کی کشاکش۔ اس لیے کہ الحمد للہ' اللہ نے مجھے اتنی سمجھ دی ہے کہ میں یہ جانتا ہوں کہ کم از کم اِس ملک میں کہ جس کا نام پاکستان ہے' یہ سیاست صرف جاگیرداروں اور بڑے زمینداروں کا مشغلہ ہے یا کسی درجہ میں سرمایہ داروں کا۔ چنانچہ جو شخص ان دونوں چیزوں سے محروم ہے' یعنی نہ وہ جاگیردار اور لینڈ لارڈ ہے' نہ اس کے پاس بہت بڑا سرمایہ ہے' اُس کا اِس میدانِ سیاست میں آنا حماقت ہے' سوائے اس کے کہ وہ کسی کا آلۂ کار بن جائے' کسی بڑے لیڈر کا کارکن بن جائے اور اس کے حوالے

سے اپنی حیثیت کے مطابق کچھ مفادات حاصل کر لے۔ باقی ہمارے ملک کی سیاست میں اگر کسی درجے میں آگے بڑھنے کا امکان ہے تو صرف ان دو طبقات کے لیے جن کا میں نے ذکر کیا ہے۔ یعنی یا تو جاگیردار ہو جسے بغیر محنت کے وافر مقدار میں دولت مل رہی ہو' لوگ کاشت کر رہے ہوں اور وہ کھا رہا ہو۔ یا پھر سرمایہ دار ہو' جیسے ہمارے نواز شریف صاحب کہتے ہیں کہ ہم نے قرضے لیے ہیں' ان پر سود دیا ہے اور یہ ملز بنائی ہیں۔ ظاہر ہے کہ میں اس اِعتبار سے چونکہ بالکل بری ہوں لہٰذا اس کا کوئی امکان نہیں کہ سیاست کے میدان میں قدم رکھوں۔ میں صرف اَمر واقعہ کے بیان پر اکتفا نہیں کر رہا ہوں بلکہ اس کی دلیل بھی دے رہا ہوں۔ امر واقعہ بھی سامنے ہے کہ اب میری زندگی آخری سرحدوں کو چھو رہی ہے اور میں کہہ سکتا ہوں کہ اب میں زندگی کی نسبت موت سے زیادہ قریب ہوں۔ سیاست کے کوچے میں اگر میرا گزر کبھی رہا ہے تو وہ بھی صرف دو ماہ اور وہ بھی اس بناء پر کہ مرحوم صدر ضیاء الحق صاحب کے بارے میں مجھے یہ گمان ہو گیا تھا کہ یہ نیک نیت ہیں اور اسلام کے متعلق کچھ کام کرنا چاہتے ہیں تو ان کی دعوت پر میں نے ان کی مجلس شوریٰ میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ انہوں نے تو مرکزی وزارت کی پیش کش کی تھی جس سے میں نے معذرت کر لی تھی' لیکن شوریٰ کی دعوت میں نے قبول کر لی تھی۔ تاہم صرف دو مہینوں ہی میں مَیں نے محسوس کر لیا کہ ان کا کچھ کرنے کا ارادہ نہیں ہے لہٰذا ''قَالُوْا سَلٰمًا'' کے مصداق میں نے انہیں سلام کیا اور وہاں سے رخصت ہو گیا۔ اس کے سوا میری پوری زندگی اِس وقت تک اس معروف سیاست سے خالی ہے۔ تو ظاہر ہے کہ میرا یہ کام سیاست کا کھیل نہیں ہے۔

دوسری بات یہ کہ اس طرح کے معاملات کو ہمارے یہاں ایک مذہبی پیشہ کی حیثیت بھی حاصل ہے۔ لیکن میرے بارے میں آپ حضرات کے علم میں ہے کہ یہ میرا پیشہ نہیں تھا۔ جہاں تک پیشے کا تعلق ہے مجھے تو اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے ایک بہتر پیشہ عطا کر دیا تھا' جسے کہا جاتا ہے کہ بڑا نوبل پروفیشن ہے۔ چاہے انسان اپنے ذاتی کردار کی وجہ سے اسے بھی ذلیل کر کے رکھ دے اور اسے محض کمائی کا دھندا بنا لے' لیکن واقعتاً اگر کسی پیشے کو

نوبل پروفیشن کہا جا سکتا ہے تو وہ میڈیکل پروفیشن ہے اور انسان چاہے تو اس کو نوبل بنا کر رکھ سکتا ہے۔ لیکن میں نے تو اس کو بھی تج دیا...... تو میرا یہ دینی کام کسی بھی درجہ میں میرے لیے پیشے کے ضمن میں نہیں ہے۔ چنانچہ میں سیاست کی طرح اس کی بھی نفی کرتا ہوں۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر اس سب کی نفی ہے تو پھر یہ کس لیے ہے؟ آپ یقین کیجیے کہ اولاً تو یہ صرف دینی فرض کا احساس ہے جس کے تحت میں یہ کام کر رہا ہوں۔ اسی احساس کے تحت میں آپ کو دعوت دے رہا ہوں اور اسی کے تحت میرے ساتھی آپ کو دعوت دے کر یہاں لائے ہیں تاکہ آپ میں بھی وہ شعور پیدا ہو جائے اور آپ بھی آخرت کی جواب دہی کے احساس کے تحت اپنے ان فرائض کی بجا آوری کے لیے کمر کس لیں۔

ثانوی درجے میں میرا یہ یقین ہے کہ اسی دینی فرض کی ادائیگی پر اُمتِ مسلمہ کی فوز و فلاح کا دار و مدار ہے۔ اگر امت یہ کام نہیں کرے گی تو بدترین عذاب کے کوڑے اس کی کمر پر برستے رہیں گے، جیسے کہ برس رہے ہیں۔ چنانچہ خواہ بوسنیا ہو، چیچنیا ہو، کشمیر ہو، افغانستان ہو یا عالمِ عرب ہو جس پر عذابِ الٰہی کا کوڑا اب برسنے ہی والا ہے (عالمِ عرب کے بارے میں محمد رسول اللہ ﷺ نے وہ خبریں دی ہیں کہ جو ان سے واقف ہیں ان پر لرزہ طاری ہوتا ہے)۔ یہ ساری سزائیں اسی لیے ہیں کہ امت نے اپنا فرض ادا نہیں کیا۔ اللہ تعالیٰ کو کافروں سے محبت نہیں اور اہل ایمان سے دشمنی نہیں، تو پھر کیا وجہ ہے کہ

رحمتیں ہیں تری اغیار کے کاشانوں پر
برق گرتی ہے تو بیچارے مسلمانوں پر!

یہ اصل میں سزا ہے۔ حال ہی میں میری جو کتاب شائع ہوئی ہے ''سابقہ اور موجودہ مسلمان اُمتوں کا ماضی، حال اور مستقبل'' ذرا کبھی اس کا مطالعہ کیجیے۔ آج حقیقت میں یہود کی بجائے اُمتِ محمد ﷺ ''مَغضُوب عَلَیھم'' کے مقام پر کھڑی ہے۔ آج کوڑے ہم پر برس رہے ہیں، عذابِ الٰہی کی گرفت میں ہم ہیں۔ آج ہم پر وہ تینوں قسم کے عذاب مسلط ہیں جن کا ذکر سورۃ الانعام میں آیا ہے: ﴿...... عَذَابًا مِّنْ فَوْقِكُمْ اَوْ مِنْ تَحْتِ اَرْجُلِكُمْ اَوْ يَلْبِسَكُمْ شِيَعًا وَّيُذِيْقَ بَعْضَكُمْ بَاْسَ بَعْضٍ ۭ﴾ (آیت ۶۵)۔

چنانچہ اوپر سے عذاب آئے تو بھی، پاؤں کے نیچے سے آئے تو بھی، اور آپس میں قومیتوں اور گروہوں میں تقسیم کر کے ٹکرا دینے والا عذاب ہو تو وہ بھی سب سے بڑھ کر اِس وقت مسلمانوں میں ہے۔ لہٰذا اُمتِ مسلمہ کی فلاح بھی اسی سے وابستہ ہے کہ وہ اپنے دینی فرائض کا احساس کرے۔

اور تیسرے درجے میں مجھے یہ یقین حاصل ہے اور اس کو میں نے دلائل کے ساتھ ثابت کیا ہے کہ وہ ملک جس کو ہم ''مملکتِ خداداد پاکستان'' کہتے ہیں اس کی بقا اور استحکام کی کوئی صورت اس کے سوا نہیں ہے کہ ہم ان دینی فرائض کو ادا کرنے کے لیے کمر کس لیں اور یہاں اللہ کے دین کو قائم کریں جس کے نام پر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔

گویا میرے نزدیک اصل میں ایک تیر سے تین شکار پیشِ نظر ہیں۔ لیکن میرے لیے اوّلیت اپنے دینی فرائض کی ادائیگی کو حاصل ہے، اس لیے کہ اُمت مسلمہ کی فلاح ہو یا پاکستان کی بقا اور اس کا استحکام ہو، ان کا تعلق اس دنیا سے ہے جبکہ میرے نزدیک اصل زندگی آخرت کی زندگی ہے۔ بفحوائے: ﴿وَاِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ﴿٦٤﴾﴾ (العنکبوت) اور اس کی فلاح و کامیابی اور نجات کا دار و مدار اس بات پر ہے کہ آپ اپنے فرائض دینی کو اپنی امکانی حد تک ادا کر رہے ہوں۔ اگر یہ کرتے ہوئے اپنے رب کے حضور حاضری ہو گی تو آپ وہاں پر کم از کم قابلِ عفو تو ہوں گے اور ﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ کے مصداق یہ عذر تو پیش کر سکیں گے کہ پروردگار میں مقدور بھر ان فرائض کی ادائیگی میں لگا رہا۔ لہٰذا اصل بنیادی محرک وہی ہے یعنی اپنے فرائض دینی کو ادا کرنا۔ البتہ ثانوی درجے میں اس کا محرک اُمتِ مسلمہ کی فوز و فلاح ہے۔ اُمتِ مسلمہ بڑی وسیع و عریض اُمت ہے۔ ایک ارب سے زیادہ تعداد پر مشتمل اس اُمت کی دُنیوی فلاح بھی اسی پر منحصر ہے۔ اور ثالثاً اس ملک خداداد پاکستان کا استحکام ہی نہیں بقا بھی اس پر منحصر ہے کہ ہم یہاں پر اس راستے کو اختیار کریں اور دین کو قائم کریں۔

ہمارے دینی فرائض

اس تمہید کے بعد اب میں آپ کے سامنے وہ دینی فرائض رکھ رہا ہوں جو میں نے سمجھے ہیں۔ میں مکرر عرض کر رہا ہوں کہ اس ضمن میں مَیں علامہ اقبال اور مولانا مودودی کا ممنونِ احسان ہوں۔ واقعہ یہ ہے کہ اگر مولانا مودودی مرحوم کی تحریریں زندگی کے ایک خاص مرحلے میں سامنے نہ آ گئی ہوتیں تو نہ معلوم زندگی کا رخ کیا ہوتا۔ حدیثِ نبویؐ کے الفاظ ہیں: ((مَنْ لَمْ یَشْکُرِ النَّاسَ لَا یَشْکُرُ اللّٰہَ)) یعنی جو انسانوں کا شکریہ ادا نہیں کرتا وہ اللہ کا شکر بھی ادا نہیں کرے گا۔ تو فرائض دینی کا وہ تصور جس کا بنیادی خاکہ اولاً علامہ اقبال سے ملا اور جس میں تفصیلات کا رنگ مولانا مودودی کی تحریروں نے بھرا' اس پر میں ۱۹ برس کی عمر سے لے کر آج ۶۳ برس کی عمر تک' یعنی ۴۴ برس سے عملاً کاربند ہوں' الحمد للہ! اور قرآن حکیم' حدیثِ نبویؐ اور سیرتِ مطہرہ کے مطالعے اور سوچ بچار سے اس تصور کے اندر نہ صرف یہ کہ وثوق بڑھا ہے' اعتماد زیادہ ہوا ہے اور اس کی گہرائی و گیرائی میں اضافہ ہوا ہے بلکہ اس کی حقانیت زیادہ سے زیادہ منکشف ہوتی چلی گئی ہے۔ تو آیئے دیکھیں کہ دینی فرائض کا وہ تصور کیا ہے۔

(۱) بندگیٔ رب

میرے نزدیک ہر مسلمان کا پہلا فرض ''عبادتِ رب'' ہے' جس کو قرآن مجید نے مقصد تخلیقِ جن واِنس قرار دیا ہے:

﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِیَعْبُدُوْنِ ﴿۵۶﴾﴾ (الذّٰریٰت)

''میں نے جنوں اور انسانوں کو پیدا ہی اس لیے کیا ہے کہ وہ میری بندگی کریں۔''

سورۃ البقرہ (آیت ۲۱) میں ارشاد فرمایا:

﴿یٰٓاَیُّهَا النَّاسُ اعْبُدُوْا رَبَّکُمُ الَّذِیْ خَلَقَکُمْ......﴾

''اے لوگو! بندگی اختیار کرو اپنے اُس رَب کی جس نے تم کو پیدا کیا......''

اللہ کی اس بندگی کا مطلب ہے ہمہ تن' ہمہ وقت' ہمہ وجوہ اللہ کی اطاعت' اللہ کے احکام کی پابندی' اللہ کے اوامر ونواہی پر کاربند ہونا۔ اور یہ جزوی نہیں' کیونکہ جزوی اطاعت' اطاعت نہیں ہے' وہ تو استہزاء اور تمسخر ہے۔ آپ نے میرا ایک حکم مانا اور دوسرا حکم پاؤں تلے روند دیا تو کیا یہ اطاعت شمار ہوگی؟ اللہ کی اطاعت وہی ہے جو کہ ہمہ تن اور ہمہ وجوہ ہو' چنانچہ اس کے تمام احکام کی اطاعت مطلوب ہے۔ اگر آپ نے اللہ کے کچھ حکم مان لیے اور کچھ نہیں مانے تو ذرا اپنے اس طرزِ عمل کا تجزیہ کیجیے۔ آپ نے جو حکم مانے وہ اس لیے کہ آپ کے نفس نے ان کو مان لیا' پسند کر لیا' گوارا کر لیا اور جو نہیں مانے وہ اس لیے نہیں مانے کہ آپ کے نفس نے ان کو پسند نہیں کیا۔ دونوں حالتوں میں آپ اپنے نفس کی اطاعت کر رہے ہیں۔ آپ نے اللہ کا جو حکم مانا ہے وہ اس لیے نہیں مانا کہ وہ اللہ کا حکم ہے' بلکہ اس لیے مانا کہ آپ کے نفس نے آپ کو اس کی اجازت دی ہے۔ اگر آپ نے اسے اللہ کے حکم کی حیثیت سے مانا ہوتا تو آپ دوسرا حکم بھی مانتے' کیونکہ وہ بھی اللہ ہی کا ہے۔

انسان کا یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کے نزدیک کس قدر ناپسندیدہ ہے' اس ضمن میں مَیں یہاں صرف ایک آیت پیش کرنے پر اکتفا کروں گا جو کہ لرزا دینے والی ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کے کچھ احکام سَر آنکھوں پر رکھے اور کچھ پاؤں تلے روند دے تو قرآن مجید کی رُو سے اس کی کیفیت یہ ہے:

﴿اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ ۚ فَمَا جَزَآءُ مَنْ یَّفْعَلُ ذٰلِکَ مِنْکُمْ اِلَّا خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا ۚ﴾ (البقرۃ:۸۵)

''کیا تم ہماری کتاب کے ایک حصے کو مانتے ہو اور ایک حصے کا انکار کرتے ہو؟ تو تم میں سے جو کوئی بھی یہ طرزِ عمل اختیار کرے گا اس کی کوئی سزا نہیں ہے اس کے سوا کہ دنیا میں ذلیل ورسوا کر دیے جائیں۔''

اب آپ دیکھ لیجیے کہ ہم دنیا میں کیوں ذلیل ہیں!

ہیں آج کیوں ذلیل کہ کل تک نہ تھی پسند
گستاخیٔ فرشتہ ہماری جناب میں!

قرآن مجید اس سوال کا جواب دے رہا ہے۔ اِس لیے کہ تم نے اللہ کے دین پر عمل اگر کیا بھی ہے تو جزوی کیا ہے' نماز روزہ ادا کیا ہے لیکن ساتھ ساتھ سودی کاروبار بھی کرتے رہے ہو' حالانکہ اللہ نے سود کو حرام قرار دیا ہے اور اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی جانب سے سود ترک نہ کرنے پر اعلانِ جنگ ہے۔ اس طرح تم درحقیقت اس آیت کے مصداق بن گئے ہو اور اس کے نتیجے میں دنیا کی ذلت ورسوائی کے مستحق قرار پائے ہو۔ آیت کے اگلے ٹکڑے میں اس طرزِ عمل کی اُخروی سزا کا ذکر ہے:

﴿وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يُرَدُّوْنَ اِلٰٓى اَشَدِّ الْعَذَابِ ۭ وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُوْنَ ۝﴾ (85)

''اور قیامت کے دن یہ شدید ترین عذاب میں جھونک دیے جائیں گے' اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ اس سے غافل نہیں ہے جو کچھ تم کر رہے ہو۔''

تم اپنی داڑھیوں سے اور اپنی نماز روزے سے کسی اور کو چاہے دھوکہ دے لو' اللہ کو دھوکہ نہیں دے سکتے۔

تو یہ پہلا فرض ہے' جو بہت کٹھن ہے' آسان نہیں ہے۔ اسی لیے تو علامہ اقبال کہتے ہیں۔

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا الٰہ را

کہ جب میں کہتا ہوں کہ میں مسلمان ہوں تو کانپ اٹھتا ہوں' مجھ پر لرزہ طاری ہو جاتا ہے اس لیے کہ مجھے معلوم ہے کہ لا الٰہ الا اللہ کہہ دینا تو آسان ہے' لیکن اس پر پورا اُترنا بہت مشکل ہے۔

فرض عبادات کا بندگیٔ رب سے تعلق

ایک مسلمان ہونے کی حیثیت سے بندگیٔ ربّ آپ کا اوّلین فریضہ ہے۔ نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ آپ کو وہ قوت فراہم کرتے ہیں جس سے آپ اس فرض کو ادا کر سکیں۔ نماز اس لیے دی گئی ہے کہ آپ کو یاد رہے کہ آپ نے اللہ سے عہدِ بندگی استوار کیا ہے۔ آپ ہر رکعت میں اللہ تعالیٰ کے ساتھ اپنے اس عہدِ بندگی کی تجدید کرتے ہیں۔ ہر رکعت میں کہتے ہیں: ﴿اِيَّاكَ نَعْبُدُ وَاِيَّاكَ نَسْتَعِيْنُ ۝﴾ یعنی ''اے پروردگار! ہم تیری ہی بندگی کرتے ہیں اور کریں گے' اور تجھ ہی سے مدد چاہتے ہیں اور چاہیں گے۔'' حفیظؔ نے کبھی بڑا پیارا شعر کہا تھا:

سرکشی نے کر دیے دھندلے نقوشِ بندگی
آؤ سجدے میں گریں لوحِ جبیں تازہ کریں

اس عہد کو تازہ کرنے کے لیے نماز ہے' مبادا تم اسے بھول جاؤ۔ روزہ اس لیے ہے کہ تمہارے اندر اپنے نفس کے تقاضوں پر کنٹرول کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ روزہ کے دوران حلال چیزیں کھانے سے بھی روک دیا جاتا ہے تاکہ گیارہ مہینوں کے لیے یہ طاقت پیدا ہو جائے کہ حرام سے بچ سکو۔ قرآن حکیم میں روزے کی غرض وغایت تقویٰ بیان کی گئی ہے: ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَي الَّذِيْنَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُوْنَ ۝﴾ (183) (البقرہ) یعنی ''اے ایمان والو! تم پر روزہ رکھنا فرض کیا گیا ہے جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کیا گیا تھا تاکہ تم بچ سکو۔'' اسی کی خاطر یہ مشق کرائی جا رہی ہے۔ عبادات دراصل مشقیں ہیں جو بندے کو اللہ کی عبادت کے لیے تیار رکھتی ہیں۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے ملٹری کو ہر وقت متحرک رکھا جاتا ہے اور اس کے لیے پریڈ ہوتی رہتی ہے۔ ساڑھے سینتالیس برسوں میں جو کہ پاکستان کو بنے ہوئے ہو گئے ہیں' جنگ تو گنتی کے چند دن ہی ہوئی ہے نا! لیکن ملٹری پر جو مسلسل خرچ ہو رہا ہے' آپ کے بجٹ کا سب سے بڑا حصہ اس کے لیے مخصوص کیا جاتا ہے' اور یہ جو مسلسل movement

ہو رہی ہے' آج یہ رجمنٹ اِدھر سے اُدھر جا رہی ہے' وہ اُدھر سے اِدھر آ رہی ہے' اب یہ سمر ایکسر سائزز ہیں' یہ ونٹر ایکسر سائزز ہیں' یہ سب اسی لیے ہیں تاکہ اچانک اگر کوئی وقت آ جائے تو یہ مقابلہ کر سکیں۔ اسی طرح یہ عبادات نماز' روزہ' حج اور زکوٰۃ ہیں جو بندے کو عبادتِ رب کے لیے مستعد رکھتی ہیں۔

''مطالباتِ دین'' کے نام سے ایک کتاب ہے' جو میری تین تقاریر پر مشتمل ہے۔ ان میں سے پہلی تقریر کا خلاصہ میں نے آپ حضرات کے سامنے رکھ دیا ہے۔ ''عبادتِ رب'' ہر مسلمان کا پہلا فرض ہے۔ جب اس نے کہا کہ "رَضِیتُ بِاللّٰہِ رَبًّا وَّبِمُحَمَّدٍ رَّسُولًا وَّبِالْاِسْلَامِ دِینًا" یعنی میں اس پر راضی ہوں' میں نے تسلیم کر لیا کہ اللہ میرا ربّ ہے' وہ میرا مالک ہے اور محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں' اور میں نے قبول کر لیا اسلام کو کہ وہ میرا دین ہے۔ یہ تسلیم کرنے کے بعد پھر لازم ہے کہ اللہ کی بندگی کرو' اس کی اطاعت کرو:

﴿وَاَطِیعُوا اللّٰہَ وَاَطِیعُوا الرَّسُولَ ۚ فَاِنْ تَوَلَّیْتُمْ فَاِنَّمَا عَلٰی رَسُولِنَا الْبَلٰغُ الْمُبِینُ ﴿۱۲﴾﴾ (التغابن)

''اللہ کی اطاعت کرو اور رسولؐ کی اطاعت کرو' پھر اگر تم روگردانی کرو گے تو ہمارے رسولؐ پر صاف پہنچا دینے کے سوا کوئی ذمہ داری نہیں!''

(۲) دعوت و تبلیغ

اب اگلے فرض کی طرف آیئے' لیکن اس سے پہلے میں یہ عرض کروں گا کہ آپ جنت خریدنا چاہتے ہیں تو اس کے لیے آپ کو بہت بڑی قیمت دینی ہو گی۔ چھوٹی سے چھوٹی دنیوی کامیابیوں کے لیے بھی کتنی محنت کرنا پڑتی ہے تو ابدالآباد کی زندگی کی بہتری کے لیے کس قدر محنت درکار ہو گی! نبی اکرم ﷺ کے ابتدائی دور کے ایک خطبے میں الفاظ آئے ہیں: ''وَاِنَّھَا لَجَنَّۃٌ اَبَدًا'' تو کیا یہ ممکن ہے کہ آپ ابدی جنت کے خریدار ہوں لیکن آپ کو کوئی مشقت نہ اُٹھانی پڑے' کوئی مشکل پیش نہ آئے' کوئی محنت اور ایثار نہ کرنا پڑے' کوئی قربانی نہ دینی پڑے اور کوئی نقصان نہ جھیلنا پڑے؟

تن آسانیاں چاہے اور آبرو بھی
وہ قوم آج ڈوبے گی گر کل نہ ڈوبی!

چنانچہ آج دنیا میں ایک ارب سے زیادہ مسلمانوں کا حال یہ ہے کہ وہ ذلت کا نشان بنے ہوئے ہیں۔ قرآن حکیم میں ﴿وَضُرِبَتْ عَلَیْھِمُ الذِّلَّۃُ وَالْمَسْکَنَۃُ وَبَآءُوْ بِغَضَبٍ مِّنَ اللّٰہِ ؕ﴾ (البقرۃ:۶۱) کے الفاظ یہود کے لیے وارد ہوئے تھے' لیکن آج ان کا مصداق مسلمان بن گئے ہیں۔ آج یہ یہود کی شان تو نہیں ہے' وہ تو آج بہت عروج پر ہیں اور امریکہ جیسی sole سپریم پاور کے سر پر سوار ہیں۔ پوری دنیا کا مالیاتی نظام ان کے ہاتھوں میں ہے۔ ورلڈ بنک ہو یا آئی ایم ایف ہو' انہی کے زیر تسلط ہے۔ آج اللہ کا غضب ان پر نہیں' ہم پر ہے۔ اللہ کے جس قانون کے تحت ان کی وہ کیفیت ہوئی تھی آج اُس قانون کی زد میں ہم آ گئے ہیں۔ ﴿فَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَبْدِیلًا ۚ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّتِ اللّٰہِ تَحْوِیلًا ﴿۴۳﴾﴾ (فاطر) اللہ کی سنت اور اس کا قانون غیر مبدّل ہے' اس میں کوئی فرق واقع نہیں ہوا۔ آپ اس کی زد میں آئیں گے تو آپ گرفت میں آ جائیں گے۔ بہرحال دینی فرائض کے ضمن میں ایک مسلمان کا دوسرا فرض اللہ کے اسی پیغام کے پیغامبر بن کر کھڑے ہو جانا ہے۔

دعوت و تبلیغ کا ختم نبوت سے تعلق

دین کی دعوت و تبلیغ یا بالفاظِ دیگر فریضۂ شہادت علی الناس ختم نبوت کا ایک ناگزیر تقاضا ہے۔ اگرچہ جب تک نبوت جاری تھی اُس وقت بھی تبلیغ صرف نبی ﷺ ہی نہیں کرتے تھے۔ آپ کو کہیں یہ مغالطہ نہ ہو جائے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم ایمان لانے کے بعد حضور ﷺ کے ساتھ دعوت و تبلیغ کے کام میں مصروف ہو جاتے تھے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ' حضور ﷺ کی دعوت پر ایمان لائے تھے' لیکن عشرہ مبشرہ رضی اللہ عنہم میں سے چھ حضرات کو ابوبکرؓ دامنِ اسلام میں لائے۔ حضرات عثمان' طلحہ' زبیر' سعد بن ابی وقاص' عبدالرحمٰن بن عوف اور سعید بن زید رضی اللہ عنہم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی تبلیغی مساعی ہی سے حلقہ

بگوشِ اسلام ہوئے۔

میں نے اپنی گفتگو کے آغاز میں سورۂ یوسف کی یہ آیت تلاوت کی تھی: ﴿قُلْ هٰذِهٖ سَبِيْلِيْٓ اَدْعُوْٓا اِلَى اللّٰهِ﴾ حضور ﷺ سے کہا جا رہا ہے کہ اے نبی کہہ دیجیے یہ ہے میرا راستہ' میں اللہ کی طرف پکار رہا ہوں۔ ﴿عَلٰى بَصِيْرَةٍ اَنَا وَمَنِ اتَّبَعَنِيْ﴾ میں علیٰ وجہ البصیرت بلا رہا ہوں اور وہ بھی جو میرے پیروکار ہیں۔ یعنی میں ایسے ہی اندھیرے میں ٹامک ٹوئیاں نہیں مار رہا ہوں' کوئی سیاسی کھیل نہیں کھیل رہا ہوں' کوئی پیشہ ورانہ تقاضے پورے نہیں کر رہا ہوں' اسے کوئی اپنا دنیوی دھندا اور جائیداد بنانے کا ذریعہ بنا کر لوگوں کو دعوت نہیں دے رہا ہوں بلکہ علیٰ وجہ البصیرت اس کام کو اپنا دینی فریضہ سمجھ کر کر رہا ہوں۔ اور اس کام میں میں تنہا نہیں ہوں' جو میرا اتباع کرنے والے ہیں وہ بھی میرے اسی مشن میں شریک ہیں۔ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗٓ﴾ میں سے ہر ایک مبلغ تھا۔

نبوت کا سلسلہ ختم ہونے کے بعد اب نبی تو کوئی نہیں آئے گا' چنانچہ اب دعوت و تبلیغ کا یہ کام تمام تر امتِ مسلمہ پر بحیثیت مجموعی فرض ہو گیا ہے۔ میں نے یہاں ''فرض'' کا لفظ جان بوجھ کر استعمال کیا ہے' کیونکہ یہ کوئی نفل نہیں ہے' اضافی نیکی نہیں ہے' بلکہ یہ بنیادی فرض ہے۔ اس لیے کہ اُمتِ مسلمہ کو تمام بنی نوعِ انسانی پر بحیثیتِ مجموعی حجت قائم کرنی ہے تاکہ وہ قیامت کے دن کھڑے ہو کر یہ نہ کہہ سکے کہ اے اللہ تیرے دین کے ٹھیکیدار تو یہ تھے' تیرے نبیؐ کے ٹھیکیدار بھی یہ بنے پھرتے تھے' یہ بڑے لہک لہک کر گایا کرتے تھے ع ''سارے نبیوں سے افضل ہمارا نبیؐ۔'' وہ نبیؐ جس کو تو نے ہمارے لیے بھیجا تھا' پوری نوعِ انسانی کے لیے مبعوث فرمایا تھا' یہ اس کو اپنا نبی بنا کر بیٹھے ہوئے تھے۔ قرآن تو کہتا ہے ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا كَاۗفَّةً لِّلنَّاسِ بَشِيْرًا وَّنَذِيْرًا﴾ (سبا:۲۸) یعنی ''ہم نے نہیں بھیجا (اے محمد ﷺ) آپ کو مگر پوری نوعِ انسانی کے لیے بشیر و نذیر بنا کر''۔ لیکن یہ اس کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے' دین کے بھی ٹھیکیدار بن گئے تھے۔ ان بدبختوں نے نہ خود دین پر عمل کیا اور نہ اسے ہم تک پہنچایا' بلکہ اپنے وجود سے' اپنے طرزِ عمل سے' اپنے کردار سے اور اپنے پورے نظامِ زندگی سے ہمارے اور

تیرے درمیان سب سے بڑی رکاوٹ بن گئے۔ ہم انہیں دیکھتے یا تیرے دین کو دیکھتے؟ ہم نے تو تیرے دین کو انہی سے پہچانا۔ یہ تیرے نبی محمد ﷺ کے نام لیوا تھے۔ دنیا میں تو اصول یہ ہے کہ درخت کو پھل سے پہچانا جاتا ہے۔ درخت پر آم کا پھل لگا ہوا ہے تو وہ آم کا درخت ہے' لیموں لگا ہوا ہے تو لیموں کا پودا ہے اور کنو لگا ہوا ہے تو کنو کا پودا ہے۔ تو یہ جو پھل ہیں اس دین کے اور رسالتِ محمدیؐ کے یہ ''بدنام کنندگانِ نکونامے چند'' ہیں' یعنی نیکوکاروں اور نیک نام لوگوں کو بھی بدنام کرنے والے ہیں۔ اس طرح قیامت کے دن حجت تو الٹی ہم پر قائم ہو جائے گی' چہ جائیکہ ہم ان پر حجت قائم کرتے۔

اُمتِ مسلمہ کی غرضِ تاسیس

قرآن حکیم میں فریضہ شہادت علی الناس کو اس امت کا فرضِ منصبی ہی نہیں' اس کی غرضِ تاسیس قرار دیا گیا ہے:

﴿وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَاۗءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا﴾ (البقرۃ: ۱۴۳)

''اور اسی طرح ہم نے تم کو ایک معتدل امت بنایا تاکہ تم گواہ ہو جاؤ لوگوں پر اور رسولؐ تم پر گواہ ہو جائے۔''

اور ظاہر ہے کہ اُمت افراد سے مل کر بنتی ہے:

افراد کے ہاتھوں میں ہے اقوام کی تقدیر
ہر فرد ہے ملت کے مقدر کا ستارہ

اگر آپ بھی یہ کہہ کر فارغ ہو جائیں کہ یہ تو اُمت کا کام ہے' میرا تو نہیں اور اسی طرح میں بھی یہ کہہ کر فارغ ہو جاؤں تو پھر یہ کام کرے گا کون؟ ہماری علاقائی زبان کی ایک کہاوت تھی ''میں بھی رانی تو بھی رانی' کون بھرے گا پانی''۔ اُمت کا ہر فرد اپنی جگہ یہ کہہ کر بَری ہو جائے کہ یہ فرض اُمت کا ہے میرا تو نہیں' تو یہ فرض کیسے ادا ہو گا؟ دین میں فرضِ کفایہ کا تصور یہی ہے کہ ایک کام کے لیے جتنی ضرورت ہے وہ اگر چند افراد نے

پوری کر دی تو سب کی طرف سے وہ فرض ادا ہو گیا، لیکن ضرورت پوری کرنے کے لیے جتنے افراد چاہئیں تھے وہ اگر نہیں نکلے تو پھر پوری آبادی گنہگار اور مجرم ٹھہرے گی۔ آج امت پوری نوعِ انسانی پر دعوت وتبلیغ کے ذریعے اور اپنے قولی وعملی مظاہرے کے ذریعے اللہ کی طرف سے حجت قائم نہیں کر رہی ہے تو اُمت کا ایک ایک فرد مجرم ہے۔ لہٰذا یہ فریضہ ایک ایک فرد پر فرضِ عین کی طرح عائد ہوتا ہے کہ اپنی توانائیاں، اپنی قوتیں اور اپنی صلاحیتیں اس کام کے لیے لگائے کہ اللہ کے پیغام کو عام کرنا ہے، اسے چاردانگِ عالم میں پھیلانا ہے، اسے بنی نوعِ انسان تک پہنچانا ہے۔

دعوت وتبلیغ کا مرکز ومحور

اللہ کے پیغام کو عام کرنے کا اصل ذریعہ قرآن حکیم ہے۔ آج کی نشست میں وقت محدود ہونے کے باعث میں اختصار سے کام لے رہا ہوں۔ قرآن حکیم میں بیسیوں مقامات پر خود قرآن کو دعوت، تبلیغ، تذکیر، تبشیر اور اِنذار کا ذریعہ قرار دیا گیا ہے۔ سورۂ قٓ کی آخری آیت میں فرمایا گیا:

﴿فَذَكِّرْ بِالْقُرْاٰنِ مَنْ يَّخَافُ وَعِيْدِ ﴿۴۵﴾﴾

’’(اے نبیؐ) اس قرآن کے ذریعے سے ہر اس شخص کو نصیحت کیجیے جو میری تنبیہہ سے ڈرتا ہو۔‘‘

سورۃ الانعام میں ارشاد ہوا:

﴿وَاُوْحِيَ اِلَيَّ هٰذَا الْقُرْاٰنُ لِاُنْذِرَكُمْ بِهٖ وَمَنْۢ بَلَغَ ۭ﴾ (آیت ۱۹)

’’(آپؐ کہہ دیجیے) اور یہ قرآن میری طرف وحی کیا گیا ہے تاکہ میں تمہیں اور جس جس کو یہ پہنچے، سب کو متنبہ کر دوں۔‘‘

یعنی جس تک یہ قرآن پہنچ جائے گا گویا کہ رسالتِ محمدیؐ کا پیغام اس تک پہنچ گیا۔ لیکن اب ہم اسے پہنچائیں گے تبھی تو پہنچے گا! سورۂ مریم کی آخری سے پہلی آیت میں الفاظ وارد ہوئے:

﴿فَاِنَّمَا يَسَّرْنٰهُ بِلِسَانِكَ لِتُبَشِّرَ بِهِ الْمُتَّقِيْنَ وَتُنْذِرَ بِهٖ قَوْمًا لُّدًّا ﴿۹۷﴾﴾

’’پس اے نبیؐ! اس کلام کو ہم نے آپؐ کی زبان پر آسان کر دیا ہے تاکہ آپؐ اس کے ذریعے پرہیزگاروں کو خوش خبری دے دیں اور ہٹ دھرم لوگوں کو متنبہ کریں۔‘‘

سورۃ المائدۃ میں رسول اللہ ﷺ سے فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الرَّسُوْلُ بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَيْكَ مِنْ رَّبِّكَ ۭ وَاِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا بَلَّغْتَ رِسٰلَتَهٗ ۭ﴾ (آیت ٦٧)

’’اے پیغمبرؐ! جو کچھ آپؐ کی طرف آپؐ کے ربّ کی طرف سے نازل کیا گیا ہے وہ لوگوں تک پہنچا دو۔ اگر آپؐ نے ایسا نہ کیا تو اس کی پیغمبری کا حق ادا نہ کیا۔‘‘

گویا دعوت وتبلیغ کا پورا مرکز ومحور قرآن ہے، جو آپ کا دوسرا فرض ہے۔ اور یہ دوسرا فرض آپ کیسے ادا کریں گے اگر آپ خود قرآن سے واقف نہیں ہیں۔ اس سنجیدہ گفتگو میں لطیفوں کی گنجائش تو نہیں، لیکن ایک مناسب حال لطیفہ پیش کر رہا ہوں کہ کوئی خان صاحب کسی بنیے کی گردن پر سوار ہو گئے کہ پڑھو کلمہ ورنہ ابھی گردن اڑاتا ہوں۔ بنیے نے کہا: اچھا خان صاحب پڑھاؤ کلمہ۔ اس پر خان صاحب کہنے لگے: ’’خو چہ کلمہ تو ہمیں بھی نہیں آتا۔‘‘ تو آپ قرآن کیا پہنچائیں گے اگر آپ قرآن جانتے ہی نہیں۔ اس لیے محمد عربی ﷺ نے فرمایا:

((خَيْرُكُمْ مَنْ تَعَلَّمَ الْقُرْآنَ وَعَلَّمَهٗ)) (رواہ البخاری عن عثمانؓ بن عفان)

’’تم میں بہترین وہ ہے جس نے خود قرآن کو سیکھا اور اسے دوسروں کو سکھایا۔‘‘

چنانچہ قرآن سیکھو اور سکھاؤ، اسے پڑھو اور پڑھاؤ۔ یہ ضروری نہیں کہ فارغ التحصیل ہونے تک انتظار کرو بلکہ اگر تم نے ایک آیت بھی سمجھ لی ہے تو اس کو پھیلانا شروع کر دو۔ حدیثِ نبویؐ ہے: ((بَلِّغُوْا عَنِّيْ وَلَوْ آيَةً)) یعنی ’’پہنچاؤ میری جانب سے خواہ ایک ہی آیت۔‘‘ لیکن جو بات میں زور دے کر کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ یہ کام فرضِ عین ہے۔ اگر اس میں کوتاہی کریں گے تو فرض کی عدم ادائیگی کے مجرم ہوں گے۔

(۳) اقامتِ دین

دینی فرائض کے ضمن میں اب ہم تیسرے فرض کو لیتے ہیں۔ آپ جانتے ہوں گے کہ اسلام دین ہے' مذہب نہیں۔ اور دین وہی ہوتا ہے جو قائم ہو' نافذ ہو' غالب ہو۔ اگر مغلوب ہو گیا تو دین نہیں رہا' مذہب ہو گیا۔ مثلاً جب عالم عرب میں آنحضور ﷺ اور آپؐ کے صحابہ کرام ؓ کی محنتوں' مشقتوں اور ایثار و قربانی سے اسلام غالب ہو گیا تو پھر جب صحابہ کرامؓ کے لشکر نکلتے تھے تو تین options دیتے تھے۔ اولاً: اسلام لے آؤ تو ہمارے برابر کے ہو جاؤ گے' ہمارے بھائی بن جاؤ گے' تمہاری جائیدادیں' تمہاری املاک' جان و مال اور عزت و آبرو سب محفوظ ہو جائیں گے۔ تم ہمارے ہم پلّہ ہو گے۔ ہم یہ نہیں کہیں گے کہ ہم پرانے مسلمان ہیں' تم نومسلم ہو لہٰذا ہمارا حق زیادہ ہے' بلکہ ہم تو برابر ہوں گے۔ ثانیاً: اگر یہ قبول نہیں تو نیچے ہو کر رہنا اور جزیہ دینا گوارا کرو' غالب اسلام ہو گا اور تم یہودی' عیسائی' مجوسی یا ہندو جو چاہو بن کر رہو۔ خواہ ایک کو مانو' سو کو مانو' ہزار کو مانو' بتوں کو پوجو' آگ کو پوجو' جو چاہو کرو۔ تمہاری جان اور مال محفوظ ہوں گے' البتہ تم سے جزیہ لیا جائے گا' لیکن غالب دین اسلام ہو گا۔ ثالثاً: اگر یہ بھی قبول نہیں تو میدان میں آؤ' تلوار ہمارے اور تمہارے مابین فیصلہ کرے گی۔ یہ اُس وقت کی صورت حال تھی جب اسلام غالب تھا۔ تب ''دین'' اسلام تھا اور اس کے تحت مختلف ''مذاہب'' تھے۔

اسلام ''مذہب'' کیسے بنا؟

جب برعظیم پاک و ہند پر انگریز کا تسلط ہو گیا تو معاملہ برعکس ہو گیا۔ اب انگریز کے نظام نے ''دین'' کی حیثیت اختیار کر لی اور اسلام ''مذہب'' بن کر رہ گیا۔ اب صورتِ حال یہ تھی کہ دین انگریز کا ہو گا۔ تم نماز پڑھو' روزہ رکھو' حج کرو' داڑھیاں رکھو' جو چاہو کرو۔ ہم یہ نہیں کہتے کہ تم ضرور شراب پیو یا زنا کرو۔ ہاں ہم زنا کے لائسنس دیں گے'

شراب کے پرمٹ جاری کریں گے' تم کون ہوتے ہو روکنے والے؟ اب یہاں فوجداری قانون ہمارا ہو گا' دیوانی قانون ہمارا ہو گا!! گویا انگریز کے دین کے تحت تابع ہو کر ہندو ہندو رہے' مسلمان مسلمان رہے۔ ہندو مندر میں جائے' مسلمان مسجد میں جائے' ہمیں کوئی اعتراض نہیں۔ تم چاہے ساری رات نماز میں کھڑے رہا کرو اور روزے تیس دن کی بجائے ۳۶۵ دن کے رکھا کرو' ہمیں کیا اعتراض ہے! تو یہ تھا وہ reversal کہ اب اسلام دین نہیں رہا بلکہ مذہب بن گیا اور سورۂ یوسف میں وارد ہونے والے الفاظ ''دِینِ الْمَلِكِ'' کے مصداق ''دین'' کی حیثیت تختِ انگلستان پر بیٹھنے والے ملکِ معظم یا ملکہ معظّمہ کے نظام نے حاصل کر لی۔ چنانچہ خواہ وہ ملکہ ہے یا ملک ہے' دین اس کا ہے' نظام اس کا ہے' دیوانی اور فوجداری قانون اسی کا چلے گا' taxation کا نظام اس کا ہو گا' خراج وہ وصول کرے گا۔ تم اپنی جگہ عبادات کرتے رہو' تمہیں اس کی اجازت ہے۔

یہ شہادت گہہِ اُلفت میں قدم رکھنا ہے

بہرحال تیسرا اور سب سے کٹھن دینی فریضہ اللہ کے دین کو قائم کرنے کی جدوجہد کرنا ہے۔ ویسے تو آسان کوئی بھی نہیں تھا۔ میں نے عرض کیا تھا کہ جنت خریدنے نکلے ہیں' جسم و جان کی ساری توانائیاں نچوڑ دیں گے تب جنت ملے گی۔ جنت کوئی اتنی گھٹیا' حقیر اور بے وقعت شے نہیں ہے کہ یونہی مل جائے۔ چنانچہ پہلا قدم بھی آسان نہیں تھا۔ بقول اقبالؒ:

چو می گویم مسلمانم بلرزم
کہ دانم مشکلاتِ لا اِلٰہ را

مسلمان بننا آسان کام نہیں ہے' اس کے لیے نفس کے خلاف لڑائی لڑنی پڑے گی' ماحول کے خلاف مدافعت کرنا پڑے گی' شیطان اور اس کی ذریت معنوی و صلبی کے خلاف جنگ آزما ہونا پڑے گا' تب کہیں اللہ کی اطاعت کر سکیں گے اور اس کے رسول ﷺ کا اتباع کر سکیں گے۔

دوسرے فریضے کی ادائیگی میں اپنے شاندار کیریئر چھوڑنے پڑیں گے۔ ظاہر ہے کہ وہی وقت اور توانائی خواہ آپ پیسے کمانے میں لگا دیں' اس سے اپنے پروفیشن میں مہارتِ تامہ بہم پہنچائیں اور اس سے جائیدادیں بنائیں' اور وہی وقت اور توانائی اگر آپ اِدھر لگائیں گے تو اپنی دنیا سکیڑنی پڑے گی۔ ع ''میری دنیا لٹ رہی تھی اور میں خاموش تھا'' کے مصداق انسان کو اپنے سامنے دیکھنا ہوتا ہے کہ دوسروں کی دنیا پھیل رہی ہے اور میری سکڑ رہی ہے۔ مکہ مکرمہ میں لوگوں کے سرمائے بڑھ رہے تھے' لیکن ابوبکر رضی اللہ عنہ کے سکڑ رہے تھے۔ مکہ کا اتنا بڑا تاجر' ملک التجار' ہجرت کے وقت تک بارہ برسوں میں وہ اللہ کا بندہ اللہ کے دین کی خاطر اپنا سب کچھ لگا چکا تھا اور جو تھوڑی سی پونجی بچ گئی تھی وہ بھی سفرِ ہجرت میں ساتھ لے کر گیا' اپنی دونوں بچیوں (حضرت عائشہ اور حضرت اسماء رضی اللہ عنہما)' بیوی اور بوڑھے نابینا باپ کے لیے ایک پیسہ نہیں چھوڑا۔ ابو قحافہ اُس وقت تک ایمان نہیں لائے تھے' مشرک تھے' فتح مکہ کے بعد ایمان لائے۔ وہ بچیوں سے کہنے لگے: ''کیا ابوبکر چلا گیا؟'' انہوں نے کہا: ''جی دادا جان!'' پوچھا: ''کچھ چھوڑ کر بھی گیا ہے؟'' انہوں نے بڑی حکمت برتی' کچھ کنکر لے کر ایک رومال میں ڈالے اور اس پر بوڑھے دادا کا ہاتھ پھیرا کہ دادا جان یہ دیکھئے' یہ مال چھوڑ کر گئے ہیں۔ تو یہ دنیا سکڑتی ہے تب کام ہوتا ہے۔ ابھی تو معروف معنوں میں جہاد شروع ہی نہیں ہوا تھا' ابھی اذنِ قتال نہیں آیا تھا' ابھی تو دعوت ہی چل رہی تھی۔ لیکن اس دعوت کے مرحلے میں بھی انسان کو فیصلہ کرنا پڑتا ہے کہ وہ اپنا وقت اور صلاحیتیں کاروبار میں لگائے یا دعوت میں لگائے۔ انسان کے پاس وقت' توانائیاں اور قوتِ کار قسم کی چیزیں محدود ہی ہوتی ہیں' اگر ان کو انسان دعوت و تبلیغ میں لگا دے تو اپنا دھندا تو سمٹے گا۔ لیکن اس کے باوجود میں کہہ رہا ہوں کہ یہ بڑی مشکل اور کٹھن منزل ہے۔

اور سب سے کٹھن اور سب سے اونچی منزل ہے دین کو قائم کرنا۔ وہ اس لیے کہ دین کو قائم کرنے کا مطلب نظام کی تبدیلی ہے' یعنی جو نظام بالفعل قائم ہے اسے ہٹائیے

اور دین کے نظام کو لائیے۔ جو نظام کہیں قائم ہوتا ہے اس کے ساتھ کچھ طبقات کے مفادات وابستہ ہوتے ہیں۔ جاگیردارانہ نظام ہے تو اس کے ساتھ جاگیرداروں کے مفادات ہیں۔ کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کا نظام بدل دیا جائے؟ سعودی عرب میں بادشاہی نظام قائم ہے۔ کیا وہ پسند کریں گے کہ ان کا یہ شاہی نظام ختم کر دیا جائے؟ وہ تو اس کا نام لینے والوں کی تکہ بوٹی کر دیں گے۔ کیا ایران کا بادشاہ آسانی سے چلا گیا تھا؟ اس نے کتنے انسانوں کی تکہ بوٹی کی تھی' کتنے لوگ تھے کہ جن کو ساوک کے بھیڑیوں نے maim کیا' جن کے بازو کاٹ دیے' جن کے جسم مفلوج کر دیے۔ اور پھر کتنے ہزاروں تھے کہ جن کے لاشے سڑکوں پر تڑپے ہیں' نہ صرف مَردوں کے بلکہ عورتوں کے بھی۔ عورتوں کا جلوس نکلا تھا شیر خوار بچوں کو گود میں لے کر' جس پر گولیوں کی بوچھاڑ کی گئی۔ اس کے بعد بادشاہ وہاں سے بھاگا ہے کہ اگر یہاں کی عورتیں اپنے شیر خوار بچوں کو گود میں لے کر فائرنگ سکواڈ کے سامنے آ سکتی ہیں تو پھر کل میرا حشر کیا ہوگا۔ ایسا نہیں تھا کہ اس کا اسلحہ ختم ہو گیا تھا۔ اسلحہ تو اس کے پاس بے شمار تھا' پورے ایشیا میں اتنا بڑا اسلحہ خانہ کسی اور ملک کے پاس نہیں تھا' لیکن وہ عوام کی طاقت کے آگے کھڑا نہ رہ سکا۔ عوام اگر مرنے کے لیے آمادہ ہو جائیں تو پھر بڑی سے بڑی طاقت ان کو شکست نہیں دے سکتی۔ لیکن بہرحال نظام کا بدلنا آسان نہیں۔ اور یہ ہے ''اقامتِ دین'' جو فرائض دینی کی تیسری اور بلند ترین منزل ہے۔ سورۃ الشوریٰ کی آیت ۱۳ میں مسلمانوں کو اسی فریضہ کی ادائیگی کا حکم دیا گیا ہے:

﴿شَرَعَ لَكُمْ مِّنَ الدِّيْنِ مَا وَصّٰى بِهٖ نُوْحًا وَّالَّذِيْٓ اَوْحَيْنَآ اِلَيْكَ وَمَا وَصَّيْنَا بِهٖٓ اِبْرٰهِيْمَ وَمُوْسٰى وَعِيْسٰٓى اَنْ اَقِيْمُوا الدِّيْنَ وَلَا تَتَفَرَّقُوْا فِيْهِ﴾

''(اے مسلمانو!) اس نے تمہارے لیے بھی دین کے بارے میں وہی شے معین کی ہے جس کی وصیت کی تھی اس نے نوحؑ کو اور جو وحی کی ہے ہم نے (اے محمد ﷺ) آپ کی جانب اور جس کی وصیت کی تھی ابراہیمؑ کو اور موسیٰؑ کو اور عیسیٰؑ کو کہ دین کو قائم کرو اور اس میں متفرق نہ ہو جاؤ!''

اسی تسلسل میں آگے چل کر آیت ۱۹ میں فرمایا گیا:

﴿اَللّٰهُ لَطِيْفٌۢ بِعِبَادِهٖ يَرْزُقُ مَنْ يَّشَآءُ ۚ وَهُوَ الْقَوِيُّ الْعَزِيْزُ ⑲﴾

''اللہ اپنے بندوں پر بڑا مہربان ہے' وہ جسے چاہتا ہے رزق دیتا ہے' اور وہ بڑی قوت والا اور زبردست ہے۔''

آدمی کو اقامتِ دین کی جدوجہد سے روکنے والی سب سے بڑی چیز اس کے معاشی معاملات ومسائل ہوتے ہیں۔ ان کے بارے میں اطمینان دلا دیا گیا کہ اللہ بڑا باریک بین ہے' وہ اپنے بندوں کی تمام ضرورتوں سے واقف ہے' وہ چڑیوں کو کھلا رہا ہے پلا رہا ہے تو کیا تمہیں نہیں کھلائے گا؟ لیکن تمہارا اس پر توکل نہیں ہے' تم اللہ پر بھروسہ نہیں رکھتے' تمہارا ایمان ویقین کمزور ہے۔

عملی نمونے کی ضرورت

نوٹ کیجیے کہ یہ سب سے کٹھن اور مشکل کام ہے۔ جب تک یہ نہیں ہوتا' ہم دنیا میں کہیں بھی پوری نوعِ انسانی کو کوئی نمونہ نہیں دکھا سکتے کہ یہ ہے اسلام۔ اُس وقت تک پوری امتِ مسلمہ کتمانِ حق کی مجرم ہے' اس نے حق کو چھپایا ہوا ہے' بلکہ اپنے وجود اور اپنے طرزِ عمل سے دوسروں کو حق سے روکنے کا سبب بنی ہوئی ہے۔ آپ دنیا کو پورے روئے ارضی پر ایک ملک تو ایسا دکھا سکیں کہ ''آؤ بھائی جسے اسلام دیکھنا ہو وہ یہاں آ کر دیکھ لے۔ یہ صرف نظریاتی باتیں نہیں ہیں' صرف لفاظی نہیں ہے' صرف وہم اور خیالات نہیں ہیں' بلکہ ہم اسلام کا عملی نمونہ پیش کر رہے ہیں۔ آؤ دیکھو' یہ ہمارا ملک ہے جہاں اسلام کا نظام قائم ہے۔ اس کی سیاست اور معیشت کو دیکھو' یہاں کی اخوت کا نقشہ دیکھو' ہمارا کفالتِ عامہ کا نظام ملاحظہ کرو کہ نہ صرف ایک ایک آدمی بلکہ حیوانات تک کی کفالت کا انتظام ہے۔ حضرت عمرؓ نے اسلامی ریاست کے سربراہ ہونے کی حیثیت سے فرمایا تھا کہ دجلہ وفرات کے کنارے اگر کوئی کتا بھی بھوکا مر گیا تو قیامت کے دن عمرؓ اس کا ذمہ دار ہوگا۔ تو آؤ دیکھو' یہ ہے کفالتِ عامہ کا نظام۔ ہمارے ہاں کوئی اونچ نیچ نہیں

ہے' سب برابر ہیں۔ پیدائشی طور پر کوئی ادنیٰ نہیں' کوئی اعلیٰ نہیں ہے۔ یہ صرف کہنے کی باتیں نہیں ہیں' کوئی لفاظی نہیں ہے' بلکہ آؤ اور ہمارا معاشرہ دیکھو''۔ اگر پوری دنیا میں کوئی ایک ملک بھی ایسا ہو تو پوری امتِ مسلمہ کی طرف سے شہادت علی الناس کا فرضِ کفایہ ادا ہو جائے گا۔ اور اگر ایک بھی نہیں ہے تو پوری امت مجرم ہے اور اس جرم کی پاداش میں عذاب کے کوڑے پڑتے رہیں گے اور ہر آنے والا کوڑا پہلے سے سخت تر ہوگا۔

اقامتِ دین کے دو ناگزیر لوازم

جیسا کہ میں نے عرض کیا' اقامتِ دین کا کام سب سے کٹھن ہے۔ اس لیے اس مرحلے پر اب جماعت کی شکل ناگزیر ہے۔ نظام انفرادی کوششوں سے نہیں بدلا کرتا۔ آپ غور کیجیے' بڑی سامنے کی بات بتا رہا ہوں کہ دنیا میں سینکڑوں نبی (علیہم الصلوٰۃ والسلام) آئے اور نبی کی شخصیت میں تو کسی اعتبار سے کوئی کمی نہیں ہو سکتی۔ ان کا اللہ پر ایمان' ان کا تقویٰ اور اخلاق و کردار' ہر پہلو سے کامل ہوتا ہے۔ لیکن انفرادی حیثیت میں وہ بھی نظام تبدیل نہیں کر سکے' اس لیے کہ لوگوں نے ساتھ نہیں دیا۔ ابراہیم علیہ السلام کی شخصیت کو لیجیے جو خلیل اللہ' ابوالانبیاء اور امام الناس ہیں' لیکن آپؑ نے کہیں اسلام کا نظام قائم نہیں کیا' اس لیے کہ لوگ ساتھ نہیں آئے۔ عیسیٰ علیہ السلام روح اللہ اور ''كَلِمَةٌ مِّنْهُ'' تھے' لیکن وہ بھی نظام قائم نہیں کر سکے۔ موسیٰ علیہ السلام مصر سے چھ لاکھ کی نفری لے کر نکلے تھے' جن میں سے بوڑھے' بچے اور عورتیں نکال دیں تو کم از کم پچاس ہزار بلکہ میرے اندازے کے مطابق ایک لاکھ افراد تو جنگ کرنے کے قابل ہوں گے' لیکن جب جنگ کا مرحلہ آیا تو پوری قوم نے کورا جواب دے دیا کہ ﴿فَاذْهَبْ اَنْتَ وَرَبُّكَ فَقَاتِلَآ اِنَّا هٰهُنَا قٰعِدُوْنَ ㉔﴾ (المائدۃ) یعنی ''جاؤ موسیٰ! تم اور تمہارا ربّ جا کر جنگ کرو' ہم تو یہیں بیٹھے ہیں''۔ یہ کٹھن کام ہم سے نہیں ہوتا' ہم سے جانیں نہیں دی جاتیں۔ تو کیا نتیجہ نکلا؟ حضرت موسیٰؑ بھی اپنی قوم سے اس درجے بیزار ہوئے کہ بارگاہ الٰہی میں عرض کیا:

﴿رَبِّ اِنِّيْ لَآ اَمْلِكُ اِلَّا نَفْسِيْ وَاَخِيْ فَافْرُقْ بَيْنَنَا وَبَيْنَ الْقَوْمِ الْفٰسِقِيْنَ ㉕﴾ یعنی

''اے پروردگار (میں کیا کروں) مجھے اختیار ہے تو بس اپنی جان کا اور اپنے بھائی (ہارون) کی جان کا (باقی کسی پر میرا زور نہیں چلتا)' پس تُو میرے اور ان فاسقوں کے مابین تفریق کر دے (اب میں ان نانہجاروں کے ساتھ رہنے کو بھی تیار نہیں ہوں)۔ اندازہ لگائیے کہ وہی نبیؑ جس کے اندر اپنی قوم کی محبت اس درجے میں تھی کہ ایک اسرائیلی کا ایک قبطی کے ساتھ جھگڑا ہو رہا تھا اور اس نے حضرت موسیٰؑ سے فریاد کرتے ہوئے مدد چاہی تو حضرت موسیٰؑ نے اس قبطی کو ایسا مکہ رسید کیا کہ اس کی جان نکال دی' لیکن اب اسی قوم سے بیزاری کا یہ عالم ہے کہ اللہ تعالیٰ کے حضور ان سے علیحدگی کی درخواست کر رہے ہیں کہ میں ان بدبختوں کے ساتھ رہنے کو تیار نہیں ہوں۔ اللہ نے فرمایا کہ نہیں' رہنا تو ساتھ ہی پڑے گا' البتہ ان کو ہم نے یہ سزا دی ہے کہ ﴿فَاِنَّهَا مُحَرَّمَةٌ عَلَيْهِمْ اَرْبَعِيْنَ سَنَةً ۚ يَتِيْهُوْنَ فِي الْاَرْضِ ؕ﴾ اپنی اس بزدلی کی وجہ سے یہ چالیس برس تک ارضِ مقدس سے محروم کر دیے گئے ہیں' یہ اسی صحرائے تیہ میں بھٹکتے پھریں گے۔ انہی چالیس سالوں کے دوران موسیٰ اور ہارون (علیہما السلام) دونوں کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی آنکھوں سے اس نظام کو قائم نہیں دیکھ سکے بلکہ اس کی حسرت ہی دل میں لیے ہوئے رخصت ہو گئے۔

نظام کب قائم ہوا؟ جب چشم فلک نے ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ؕ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗۤ اَشِدَّآءُ عَلَى الْكُفَّارِ رُحَمَآءُ بَيْنَهُمْ﴾ (الفتح: ۲۹) کا نقشہ دیکھا' جب صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی وہ جماعت وجود میں آئی جنہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ہاتھ پر بیعت کی:

بَايَعْنَا رَسُوْلَ اللّٰهِ صلی اللہ علیہ وسلم عَلَى السَّمْعِ وَالطَّاعَةِ فِي الْعُسْرِ وَالْيُسْرِ وَالْمَنْشَطِ وَالْمَكْرَهِ وَعَلٰى اَثَرَةٍ عَلَيْنَا وَعَلٰى اَنْ لَا نُنَازِعَ الْاَمْرَ اَهْلَهٗ وَعَلٰى اَنْ نَقُوْلَ بِالْحَقِّ اَيْنَمَا كُنَّا لَا نَخَافُ فِي اللّٰهِ لَوْمَةَ لَائِمٍ

''ہم نے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اس بات پر بیعت کی ہے کہ آپؐ جو حکم دیں گے اسے مانیں گے چاہے مشکل ہو چاہے آسان ہو' چاہے اس کے لیے ہماری طبیعتیں آمادہ ہوں اور چاہے ہمیں اپنی طبیعتوں پر جبر کرنا پڑے' چاہے ہم پر

دوسروں کو ترجیح دے دی جائے' اور جنہیں آپؐ ذمہ دار بنائیں گے ان سے جھگڑیں گے نہیں' البتہ جو حق بات ہو گی وہ ہم کہہ کر رہیں گے اور اللہ کے دین کے معاملے میں ہم کسی ملامت گر کی پروا نہیں کریں گے۔''

اِس عہد اور قول وقرار میں ''مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ'' صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ ''وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ'' رضی اللہ عنہم بندھ گئے تو نظام قائم ہوا۔ یہ حدیث متفق علیہ ہے اور اس کے راوی حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ ہیں۔

چنانچہ ''اقامتِ دین'' کی اس جدوجہد کے لیے التزام جماعت فرض ہے۔ اسے اس مثال سے سمجھئے کہ نماز فرض ہے' لیکن کیا یہ بغیر وضو ہو جائے گی؟ ہرگز نہیں! چنانچہ نماز کے لیے وضو بھی فرض ہو گیا' حالانکہ وضو مقصود نہیں ہے۔ ایک بڑا پیارا شعر یاد آ رہا ہے' مضمون بہت ثقیل ہو گیا ہے لہٰذا تھوڑا سا لطافت کا رنگ بھی آ جائے:

یہ نہ سمجھو کہ یہ نمازی ہیں
میر صاحب وضو کے عادی ہیں

وضو کرتے رہتے ہیں' نماز نہیں پڑھتے۔ لیکن اس کے برعکس نماز پڑھنے کے لیے وضو لازم ہے اور وضو کے لیے پاک پانی لازم ہے۔ اگر کوشش کے باوجود پاک پانی نہیں ملا تو پھر تیمّم اس کا قائم مقام ہو جائے گا' لیکن پاک پانی تلاش کرنا فرض ہے۔ فقہاء نے لکھا ہے کہ اگر پانی کچھ فاصلے پر بھی ہے تب بھی تم کو تیمّم کرنے کا حق نہیں' بلکہ جا کر پاک پانی لے کر آؤ! اسی طرح اقامتِ دین کے لیے جماعت فرض ہے اور جماعت کے لیے بیعت فرض ہے۔ ترتیب وہی ہے۔ پاک پانی کی جگہ بیعت کو' وضو کی جگہ جماعت کو' اور نماز کی جگہ اقامتِ دین کو رکھئے۔ جس طرح نماز فرض ہے' اس کی ادائیگی کے لیے وضو فرض ہے اور وضو کے لیے پاک پانی فرض ہے اسی طریقے پر اقامتِ دین کی جدوجہد فرض ہے' اس کے لیے جماعت لازم ہے اور جماعت کے لیے بیعت لازم ہے۔ اقامت دین جیسا کٹھن کام ڈھیلی ڈھالی جماعت سے نہیں ہوتا' چار آنے کی ممبری والی جماعت سے یہ کام نہیں ہوتا۔ انقلاب لانے کے لیے بڑی منظّم (organized) اور

disciplined جماعت درکار ہے۔ سمع و طاعت (listen and obey) والی جماعت درکار ہے۔ لیکن اس ضمن میں اِس جماعت اور صحابہ کرامؓ کی جماعت میں یہ فرق ہو گا کہ حضور ﷺ کی اطاعت مطلق تھی‘ آپؐ جو بھی حکم دیں اس کی اطاعت فرض تھی‘ کیونکہ آپؐ غلط حکم دے ہی نہیں سکتے۔ آپؐ تو اللہ کے نبی ہیں۔ آپؐ کی شان میں سورۃ النجم میں یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿وَمَا یَنۡطِقُ عَنِ الۡہَوٰی ﴿۳﴾ اِنۡ ہُوَ اِلَّا وَحۡیٌ یُّوۡحٰی ﴿۴﴾﴾

’’اور وہ ﷺ اپنی خواہشِ نفس سے نہیں بولتے۔ یہ تو ایک وحی ہے جو اُن پر نازل کی جاتی ہے۔‘‘

البتہ حضور ﷺ کے بعد جس سے بھی بیعتِ سمع و طاعت ہو گی وہ ’’فی المعروف‘‘ کی شرط کے ساتھ ہو گی۔ یعنی امیر شریعت کے دائرہ کے اندر اندر کوئی بھی حکم دے سکتا ہے۔ سر آغا خان کی طرح کی اطاعت نہیں ہے کہ وہ چاہیں تو شراب کو جائز قرار دے دیں اور چونکہ سر آغا خان اجازت دے رہے ہیں‘ اس لیے وہ جائز ہو گئی۔ نہیں‘ شراب حرام ہے‘ حرام ہی رہے گی۔ کسی امام کو یہ حق حاصل نہیں کہ وہ شراب کو حلال قرار دے دے‘ کسی پیر کو یہ حق حاصل نہیں کہ آپ کو نماز سے بری قرار دے دے۔ ایسے ملنگ قسم کے پیر آپ کو اسی شہر لاہور میں مل جائیں گے کہ ان کو نذرانے دے دیا کیجیے‘ باقی کیا ضرورت ہے نماز کی۔ وہ آپ کو نماز سے فرار کا فتویٰ دے سکتے ہیں۔ ایسی اطاعت سراسر گمراہی ہے۔ شریعت کے دائرے کے اندر اطاعت مطلوب ہے۔ شریعت کے اوامر‘ اوامر رہیں گے اور شریعت کے نواہی‘ نواہی رہیں گے۔ شریعت نے جس چیز کو حرام اور ممنوع کہا ہے وہ حرام اور ممنوع رہے گی اور جس کو فرض اور واجب کہا ہے وہ فرض اور واجب رہے گی۔ اس دائرے کے اندر اندر امیر جماعت جو حکم دے گا اس کا ماننا ضروری ہو گا۔

مزید برآں تنظیمی معاملات میں مشورہ بھی ضروری ہے‘ بفحوائے ﴿وَاَمۡرُہُمۡ شُوۡرٰی بَیۡنَہُمۡ﴾ ...... لیکن مشورہ کے بعد فیصلہ گنتی سے نہیں ہو گا‘ ع ’’بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے‘‘ والی بات نہیں ہو گی۔ مشورہ امیر کی ضرورت ہے‘ لہٰذا آپ کا امیر آپ کے

مشوروں سے فائدہ اٹھائے گا۔ اسے کیا اپنے پاؤں پر کلہاڑی مارنی ہے جو وہ آپ کا اچھا مشورہ رد کر دے۔ چنانچہ اپنی امکانی حد تک بہتر سے بہتر رائے تک پہنچنے کے لیے وہ آپ کے مشورے سے استفادہ کرے گا‘ لیکن بہرحال فیصلہ اسی کے اختیار میں ہے۔ یہ ہے وہ نظمِ جماعت جو اقامتِ دین کے لیے لازم ہے اور لازم ہونے کے درجے میں فرض ہے۔ چنانچہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((مَنْ مَاتَ وَلَیْسَ فِیْ عُنُقِہٖ بَیْعَۃٌ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً)) یعنی ’’جو مسلمان اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے وہ جاہلیت کی موت مرا‘‘۔ آپ حدیث کے الفاظ پر غور کیجیے۔ جس طرح آپ کوئی جانور لے کر جاتے ہیں اور اس کی گردن کا پٹہ آپ کے ہاتھ میں ہوتا ہے بالکل وہی الفاظ محمد رسول اللہ ﷺ نے بیعت کے لیے استعمال کیے ہیں۔

صوبہ سرحد کے ایک بہت بڑے عالمِ دین مجھ سے ملنے کے لیے تشریف لائے تھے۔ دورانِ گفتگو فرمانے لگے کہ ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ جماعت کے اندر امیر کو شوریٰ کے مشورے کا پابند ہونا چاہیے‘ یعنی شوریٰ کی اکثریت کے فیصلے کو ماننا امیر پر لازم ہونا چاہیے۔ ان کے ساتھ ایک مقامی عالمِ دین بھی تھے۔ میں نے کہا: جناب ’’امیر‘‘ کے معنی کیا ہوتے ہیں؟ فرمایا: حکم دینے والا! میں نے کہا کہ پھر اس لفظ کو چھوڑ دیجیے اور صدر کا لفظ اختیار کیجیے۔ اس لیے کہ ہمارے ہاں آج کل جو مغربی تصور ہے اس میں تو پریذیڈنٹ ہی ہوتا ہے۔ پھر میں نے کہا: اچھا یہ فرمائیے کہ آمر کسے کہتے ہیں؟ اس پر وہ ٹھٹکے۔ میں نے کہا: ’’امیر‘‘ کا لفظ ’’آمر‘‘ سے زیادہ گاڑھا ہے یا نہیں؟ آمر تو اسم فاعل ہے اور اسم فاعل عارضی ہوتا ہے جبکہ صفتِ مشبہ فعیل کے وزن پر آتی ہے اور وہ صفت مستقل ہو جاتی ہے۔ چنانچہ امیر میں تو آمریت بدرجہ اَتم موجود ہونی چاہیے۔ اس پر موصوف کے ساتھ آنے والے مقامی عالمِ دین کہنے لگے: ’’مولانا! ڈاکٹر صاحب اس موضوع پر خوب تیار ہیں‘ ان کے ساتھ ذرا سنبھل کر بات کیجیے۔‘‘

تو جان لیجیے کہ ''امیر'' تو ''آمر'' سے بھی زیادہ سخت لفظ ہے۔ چنانچہ معروف کے دائرے کے اندر اندر امیر کا ہر حکم ماننا ہوگا' جبکہ نفس اسی کو گوارا نہیں کرتا۔ وہ کیوں کسی کے سامنے جھکے؟ وہ کسی کی بالادستی کیوں قبول کرے؟ اور جب تک یہ نہیں کریں گے جماعت کیسے بن جائے گی؟ جدوجہد کیسے ہوگی؟ پھر تو وہ حشر ہوگا جو مالاکنڈ میں آپ نے دیکھ لیا' حالانکہ وہاں لوگ جانیں دینے کو تیار تھے' ان کے خلوص پر آپ شک نہیں کر سکتے' لیکن حال یہ ہے کہ صوفی محمد صاحب جو کہ امیر ہیں وہ ہاتھ جوڑتے پھر رہے ہیں کہ نکل آؤ مورچوں سے' لیکن لوگ نہیں نکل رہے۔ اقامتِ دین کی جدوجہد کے لیے تو وہ جماعت مطلوب ہے کہ جسے حرکت کرنے کا حکم دیا جائے تو صورت وہ ہو جو "Charge of the Light Brigade" نامی نظم میں آپ میں سے اکثر نے پڑھی ہوگی۔ حکم دیا گیا لائٹ بریگیڈ کو کہ "Charge for the guns!" ہر شخص کو معلوم تھا کہ "someone had blundered" بڑا غلط معاملہ ہوا ہے' بڑا غلط فیصلہ ہوا ہے۔ دائیں طرف توپیں ہیں' بائیں طرف توپیں ہیں' سامنے توپیں ہیں:

Cannon to right of them,
Cannon to left of them,
Cannon in front of them,
volleyed and thundered;

اب اس صورتحال میں حملہ کرنا گویا کہ موت کے منہ میں جانا ہے۔ لیکن

Theirs not to make reply,
Theirs not to reason why,
Theirs but to do and die.
Into the valley of death
Rode the six hundred.

فوجی کا کام یہ پوچھنا نہیں ہے کہ آپ نے مجھے یہ حکم کیوں دیا ہے' بلکہ اس کا کام یہ ہے کہ اسے جو حکم دیا گیا ہے اس پر بلاچون وچرا عمل کرے (listen and obey)۔ لہٰذا چھ سو کے چھ سو موت کی وادی میں اتر گئے۔ یہ فوج کا ڈسپلن ہے۔ یہی سمع وطاعت ہے جو

یہاں مطلوب ہے۔ چنانچہ قرآن حکیم نے اس لفظ کو کئی بار استعمال کیا ہے۔ مثلاً ''فَاسْمَعُوْا وَاَطِيْعُوْا'' اور ''اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا'' اور ''وَقَالُوْا سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا''۔

سابقہ گفتگو کا خلاصہ

آگے بڑھنے سے قبل اب تک کی گفتگو کا خلاصہ پیش کرتا ہوں۔ اس کوچہ میں پہلا قدم ہی سوچ سمجھ کر رکھنے کی ضرورت ہے۔ پہلا فرض: ہمہ وقت' ہمہ تن اللہ کی بندگی۔ دوسرا فرض: اللہ کے دین کی دعوت وتبلیغ کے لیے اپنے تن من دھن کا بیشتر اور بہتر لگا دینا اور اپنے لیے' اپنی معاش کے لیے' اپنے گھر والوں کے لیے کمتر اور کہتر رکھنا۔ اللہ کے دین اور اپنی ذات کے مابین نسبت وتناسب کا معاملہ یہی ہونا چاہیے۔ اگر آپ نے بہتر اپنے لیے رکھا اور کہتر دین کے لیے رکھا تو ناکام ہوگئے۔ اس ضمن میں ایک بڑا پیارا اور سبق آموز واقعہ بیان کیا جاتا ہے کہ کسی مرشد کے پاس کوئی صاحب بہت عرصہ زیر تربیت رہے۔ اپنا سلوک مکمل کر کے جب رخصت ہونے لگے تو کہا: حضرت کوئی آخری نصیحت فرمائیں۔ انہوں نے کہا: بھئی میں نے تمہیں بہت کچھ بتایا ہے' جاؤ اس پر عمل کرو۔ لیکن وہ صاحب کہنے لگے: نہیں جی! کوئی آخری نصیحت فرما دیجیے۔ ان کے اصرار پر مرشد نے کہا: دیکھنا اللہ کو اپنے سے کہیں کمتر نہ سمجھنا۔ کہنے لگے: جی بالکل نہیں' اللہ کو کیسے کمتر سمجھوں گا۔ انہوں نے راستے کے لیے دو روٹیاں ساتھ دے دیں' جن میں ایک پراٹھا تھا اور ایک سوکھی روٹی۔ راستے میں بھوک لگی' کھانا کھانے کے لیے بیٹھے تو کوئی سائل آ گیا کہ اللہ کے نام پر مجھے بھی کچھ دے دیں' تو حاتم طائی کی قبر پر لات ماری اور پوری سوکھی روٹی اسے دے دی اور پراٹھا اپنے لیے رکھ لیا۔ کچھ عرصہ کے بعد جب واپس پہنچے تو مرشد صاحب بات نہیں کر رہے' سلام کا جواب نہیں دے رہے۔ عرض کیا: حضرت کیا ہوا؟ فرمایا کہ اتنا اصرار کر کے تم نے مجھ سے آخری نصیحت لی تھی اور گھر پہنچنے تک بھی اس پر عمل نہ کر سکے۔ اللہ کے نام پر دی تو سوکھی روٹی۔ کیا اللہ کو کمتر جانا یا بہتر جانا؟ اور اپنے لیے جو پراٹھا رکھا تو کیا اپنے آپ کو کمتر سمجھا یا بہتر؟ حدیث میں آتا ہے

کہ اللہ شکوہ کرے گا اپنے بندے سے کہ اے بندے' میں بیمار تھا' تو نے میری عیادت نہیں کی! اے بندے' میں بھوکا تھا' میں نے تجھ سے کھانے کے لیے مانگا' تو نے مجھے کھانے کو نہیں دیا! اس کا مطلب کیا ہے؟ یہ کہ جس نے تجھ سے کھانے کے لیے مانگا وہ میرا بندہ تھا' میرے نام پر مانگ رہا تھا۔ اَلْخَلْقُ عَیَالُ اللّٰہِ ۔ تو اگر آپ دین کے لیے کمتر اور کہتر لگائیں گے تو آپ فیل ہو گئے۔ اور اگر اپنی زندگی کی ناگزیر ضروریات کے لیے قدرِ قلیل حصہ رکھ کر انسان اپنے مال اور اپنی صلاحیتوں اور توانائیوں کا بیشتر اور بہترین حصہ دین کے لیے لگا دے تو تب اسے کامیابی کی امید رکھنی چاہیے۔

فرائض دینی کی عمارت کی تیسری منزل ہے اقامتِ دین کی جدوجہد۔ یعنی دین کو غالب کرنے کی کشمکش۔ اور اس کے لیے لازم ہے ''جماعت''۔ اور جماعت بھی آرمی ڈسپلن والی' اِسْمَعُوْا وَاَطِیْعُوْا (listen and obey) والی جس کے لیے مسنون' ماثور اور منصوص اساس بیعت کی ہے۔ قرآن میں ذکر ہے تو بیعت کا ہے' حدیث میں ذکر ہے تو بیعت کا ہے' سیرت میں مختلف مراحل پر بیعت ہے۔ پھر اگر خلافت راشدہ قائم ہوئی تو بیعت کی بنیاد پر۔ ہمارے ہاں لوگوں کی اصلاحِ نفس کا سلسلہ قائم ہے تو وہ بھی بیعت پر ہے۔ حضرت حسین ؓ حکومت کی اصلاح کے لیے میدان میں آئے تو بیعت کی بنیاد پر۔ یہ اور بات ہے کہ بیعت کرنے والے اپنی بیعت سے پھر گئے۔ اس کا وبال ان پر ہو گا' جیسا کہ سورۃ الفتح میں فرمایا گیا: ﴿فَمَنْ نَّکَثَ فَاِنَّمَا یَنْکُثُ عَلٰی نَفْسِہٖ﴾ (آیت ۱۰) یعنی ''جو بیعت توڑتا ہے وہ اپنے اوپر اس کا وبال لیتا ہے''۔ بیعت کی خلاف ورزی کرنے والا اس کا وبال اپنے اوپر لیتا ہے۔ حضرت حسین ؓ کا کیا بگڑا؟ آپؓ نے تو شہادت کا جام نوش کر لیا۔ اصل میں بگڑا تو ان کوفیوں کا جنہوں نے حضرت حسینؓ کے ہاتھ پر ہزاروں کی تعداد میں بیعت کی تھی اور اس کے بعد جب ابن زیاد کا ڈنڈا چلا تو سب کے سب بیعت توڑ کر پیچھے ہٹ گئے۔ پھر آپ کو معلوم ہے کہ پچھلی صدی میں اس برعظیم پاک و ہند میں تحریک شہیدینؒ اٹھی تو وہ بھی بیعت کی بنیاد پر تھی۔ یہ بیعتِ جہاد تھی۔ چنانچہ ہمارے ہاں تو ایک ہی درست طریقہ ہے۔ باقی سارے طریقے مغرب

سے درآمد شدہ ہیں' جنہیں میں حرام نہیں کہہ رہا' لیکن بہرحال یہ منصوص' ماثور اور مسنون نہیں ہیں۔ اُمتِ مسلمہ کی پوری تاریخ میں ایک ہی طریقۂ تنظیم ثابت ہے اور وہ بیعت کا نظام ہے۔

آپ غور کیجیے کہ مسلمانوں کی اجتماعیت میں دو ہی حالتیں ممکن ہیں: یا تو اسلامی حکومت یعنی نظامِ خلافت ہے یا نہیں ہے۔ اگر اوّل الذکر صورت ہے تو امیر المومنین کے ہاتھ پر بیعت ہو گی جیسے کہ حضرات ابوبکر' عمر' عثمان' علی اور حسن (رضی اللہ عنہم) کے ہاتھ پر ہوئی اور اگر نظامِ خلافت قائم نہیں ہے تو اسے قائم کرنے کے لیے جماعت درکار ہو گی اور اس جماعت کے امیر کے ہاتھ پر بیعت ہو گی۔ تیسری کوئی حالت ممکن ہی نہیں ہے۔ میں حدیث بیان کر چکا ہوں کہ ''جو شخص اس حال میں مرا کہ اس کی گردن میں بیعت کا قلادہ نہیں ہے' فَقَدْ مَاتَ مِیْتَۃً جَاھِلِیَّۃً'' وہ شخص جاہلیت کی موت مرا'' اور آپ کو معلوم ہے کہ جاہلیت کسے کہتے ہیں۔ اسلام سے قبل کا زمانہ دورِ جاہلیت کہلاتا تھا۔

اقامتِ دین کی جدوجہد کا طریق کار

اب میں آپ کے سامنے یہ بات رکھ رہا ہوں کہ اقامتِ دین کی جدوجہد کا طریق کار کیا ہے! یہ کام ہو گا کیسے؟ یہاں بھی وہی اسلوب اختیار کروں گا یعنی پہلے نفی اور پھر اثبات۔ پہلے میں دو باتوں کی نفی کر رہا ہوں...... محض خواہش سے یہ کام نہیں ہو سکتا اور محض دعاؤں سے بھی یہ کام نہیں ہو سکتا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس ضمن میں کسی وضاحت کی ضرورت نہیں ہے کہ یہ کام محض خواہش سے ہو گا نہ محض دعاؤں سے' بلکہ محنت اور مشقت سے ہو گا' ایثار اور قربانی سے ہو گا' جانفشانی اور سرفروشی سے ہو گا۔ لیکن سوال پیدا ہوتا ہے کہ یہ محنت و مشقت کس اسلوب پر ہو؟

انتخابی طریق کار؟

اس جدوجہد کی ایک امکانی صورت یہ نظر آتی ہے کہ انتخابات میں حصہ لیا جائے'

اگر مسلمانوں کی اکثریت ووٹ دے دے تو ہمارے ہاتھ میں اختیار آ جائے گا‘ ہم بیٹھ کر قانون بدل دیں گے۔ یہ نظریہ اگرچہ بالکل دو اور دو چار کی طرح صحیح دکھائی دے رہا ہے لیکن حقیقت واقعی کے اعتبار سے غور کیجیے تو نظر آئے گا کہ آپ کے ملک میں ایک جاگیرداری نظام قائم ہے اور اسی فیصد ووٹر جاگیرداروں کے قبضے میں ہیں‘ جہاں وہ دَم نہیں مار سکتے۔ صرف یہ ہوسکتا ہے کہ ایک جاگیردار کے بجائے دوسرا جاگیردار آ جائے‘ چچا کے بجائے بھتیجا جیت جائے۔ باقی جاگیرداروں کی مملکت کے اندر کوئی اور جیت جائے ع ایں خیال است و محال است و جنوں! یہی وجہ ہے کہ خواہ کوئی دور ہو‘ آپ کے ہاں اسمبلیوں کے اندر ہمیشہ وہی جاگیردار ہوتے ہیں۔ ضیاء الحق صاحب کا دور تھا تو وہی ان کی شوریٰ میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم جیسے تو ہوں گے کوئی آٹے میں نمک کے برابر۔ اگر وہ بھٹو کی اسمبلی تھی تو وہی جاگیردار وہاں تھے۔ اب تو بے شرمی اور ڈھٹائی کا یہ عالم ہے کہ چچا بھتیجے کا فرق بھی نہیں کرتے‘ ایک ہی شخص اپنے ماتھے کا لیبل بدلتا رہتا ہے‘ وہی مسلم لیگ میں ہوتا ہے اور وہی پیپلز پارٹی میں۔ وہی کبھی ری پبلکن پارٹی میں تھا‘ کبھی شوریٰ میں آ گیا اور پھر وہ پیپلز پارٹی میں چلا گیا۔ لہٰذا انتخابات کے ذریعے سے نظام کو تبدیل کرنا جتنا اچھا اور سہل نظر آتا ہے یہ اسی قدر مشکل ہے۔ یہ ہونے والی بات ہے ہی نہیں۔ نظام کبھی الیکشن کے ذریعے نہیں بدلتا۔ اس میں تو ع ”بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے“۔ یہاں تو ”One man one vote“ کا اصول کارفرما ہے اور جب ووٹروں کی اکثریت جاگیرداروں کے قبضے میں ہے تو ظاہر ہے کہ اختیار انہی کے ہاتھ میں رہے گا۔ انہی کا یہ میوزیکل چیئرز کا کھیل ہے جسے وہ سیاست کے نام سے کھیل رہے ہیں۔ یہ زیادہ فساد مچا دیتے ہیں تو کچھ عرصے کے لیے جرنیل آ جاتے ہیں اور جب نظر آتا ہے کہ جرنیلوں سے بھی پبلک اکتا گئی ہے تو انہی جاگیرداروں میں سے کچھ مہرے سامنے لے آئے جاتے ہیں اور فوج پیچھے چلی جاتی ہے۔ تو یہ ایک سرکل ہے جو تھوڑے تھوڑے عرصے سے ہمارے ہاں چلتا رہتا ہے۔ چنانچہ الیکشن کے ذریعے سے یہ کام نہیں ہوسکتا۔

اس ضمن میں ایک اصولی بات سمجھ لیجیے کہ الیکشن تو کسی نظام کو چلانے کے لیے ہوتے ہیں‘ نہ کہ نظام کو بدلنے کے لیے۔ امریکہ کے انتخابات میں دو پارٹیاں‘ ری پبلکن پارٹی اور ڈیموکریٹس‘ حصہ لیتی ہیں اور ان دونوں کے مابین امریکن نظام کے بارے میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ وہ ان کے نزدیک متفق علیہ ہے‘ صرف اس نظام کو چلانے کے لیے پالیسیوں میں تھوڑا سا فرق ہوگا۔ مثلاً ٹیکسیشن کی پالیسی میں کچھ اختلاف ہوگا کہ ہم یہ چھوٹ دے دیں گے یا ہم یہ نرمی کر دیں گے۔ اسی طریقے سے ہیلتھ پالیسی وغیرہ میں کچھ مراعات کا معاملہ ہوسکتا ہے۔ اسی طرح برطانیہ میں لیبر پارٹی اور کنزرویٹو پارٹی میں نظام کی حد تک کوئی اختلاف نہیں ہے۔ امیگریشن کے بارے میں تھوڑا اختلاف ہوگا کہ ڈھیلا کر دیں گے یا سخت کر دیں گے یا بعض اور جزوی چیزیں ہوں گی۔ لوگ ووٹ ڈالتے ہیں اور ان میں سے کسی ایک پارٹی کو منتخب کر لیتے ہیں جو نظام چلاتی ہے‘ جبکہ دوسری پارٹی اپوزیشن میں بیٹھتی ہے۔ اس کے برعکس نظام کو بدلنے کے لیے انقلاب لانا پڑتا ہے۔ ہمارے ہاں تو بہتر سے بہتر الیکشن ہوئے ہیں لیکن اس کے بدتر سے بدتر نتائج نکلے ہیں‘ صرف دینی اعتبار ہی سے نہیں دنیاوی اعتبار سے بھی۔ ہمارے ہاں ایک بڑا صاف اور شفاف الیکشن ۱۹۷۰ء میں ہوا تھا‘ لیکن اس کا نتیجہ ۱۹۷۱ء میں یہ نکلا کہ ملک دولخت ہوگیا۔ پچھلا الیکشن جو ہوا‘ اسے پوری دنیا نے مانا ہے کہ جس حد تک ہمارے معاشرے میں ہوسکتا ہے یہ ایک صاف اور شفاف الیکشن تھا‘ لیکن اس کا حاصل آپ کے سامنے ہے۔ لہٰذا اس راستے سے اسلام نہیں آئے گا۔

دعوت و تبلیغ؟

اسی طرح ایک نظریہ یہ ہے کہ دعوت و تبلیغ کیے چلے جاؤ‘ کیے چلے جاؤ‘ جب اکثریت بدل جائے گی تو نظام بدل جائے گا۔ نظری طور پر یہ بھی بڑی سیدھی اور منطقی بات نظر آتی ہے اور ہمارے ہاں ایک بڑی عظیم تحریک اس نظریئے کو بنیاد بنا کر چل رہی ہے۔ اوّل الذکر راستے پر تو خیر بہت سی تحریکیں اور جماعتیں ہیں‘ لیکن اس ثانی الذکر

راستے کو تبلیغی جماعت اپنائے ہوئے ہے۔ اس کے ضمن میں مَیں صرف ایک جملے پر اکتفا کروں گا کہ اگر محض دعوت و تبلیغ، تعلیم و تلقین اور فضائل کی ترغیب و تشویق سے دین قائم ہوسکتا تو کیا محمد عربی ﷺ تلوار ہاتھ میں لیتے؟ کیا آپؐ سے بڑا کوئی مبلغ، کوئی مربی، کوئی معلم اور کوئی مزکی ممکن ہے؟ اگر آپؐ کو بھی تلوار ہاتھ میں لینی پڑی اور اپنے سینکڑوں صحابہؓ کی جانوں کا نذرانہ پیش کرنا پڑا تو پھر کون یہ دعویٰ کرسکتا ہے کہ یہ صرف دعوت و تبلیغ سے ہو جائے گا۔ اس راستے میں محمد عربی ﷺ نے اپنے خون کا نذرانہ بھی پیش کیا ہے۔ آپؐ کا اپنا خون مکی دور میں طائف کی سرزمین پر گرا ہے اور مدنی دور میں دامنِ اُحد میں جذب ہوا ہے۔ آپؐ کی رخسار کی ہڈی پر جب تلوار کا وار پڑا ہے تو خون کا فوارا چھوٹا ہے اور اتنا خون بہا ہے کہ آپؐ نقاہت کی وجہ سے بیہوش ہو گئے۔ تو اس کے بغیر یہ کام نہیں ہوتا۔ اگر صرف دعوت و تبلیغ اور تلقین و تشویق سے یہ کام ہوسکتا تو میں دعوے سے کہتا ہوں کہ رحمۃ للعالمین ﷺ اپنے کسی جاں نثار صحابیؓ کا خون تو کجا، کسی کافر کے خون کا ایک قطرہ بھی زمین پر نہ گرنے دیتے۔

دعوت و تبلیغ کی اہمیت اپنی جگہ ہے۔ دعوت و تبلیغ سے آپ لوگوں کو جمع کیجیے، سلیم الفطرت لوگوں کو کھینچئے۔ انقلاب کے لیے پہلا ہتھیار واقعتاً دعوت و تبلیغ ہی ہے۔ لیکن جو لوگ اس کے ذریعے سے آجائیں انہیں پھر منظّم کیجیے۔ ان دھاگوں کو بٹ کر کوڑا بنائیے اور پھر وہ کوڑا باطل کے سر پر دے ماریئے۔ بفحوائے قرآنی: ﴿بَلْ نَقْذِفُ بِالْحَقِّ عَلَى الْبَاطِلِ فَيَدْمَغُهُ﴾ یہ سورۃ الانبیاء کی آیت ۱۸ کا ٹکڑا ہے جس میں فرمایا گیا ہے کہ ''ہم حق کا کوڑا مارتے ہیں باطل کے اوپر جو اس کا بھیجا نکال دیتا ہے''۔ چنانچہ پہلے کوڑا بناؤ جیسے محمد عربی ﷺ نے کوڑا بنایا۔ جس طرح ایک پرندہ گھونسلا بناتا ہے تو ایک ایک تنکا لے کر آتا ہے اسی طرح حضور ﷺ نے افراد کو جمع کیا۔ دس برس میں تو حضور ﷺ کے پاس بمشکل سوسوا سو آدمی جمع ہوئے تھے۔ محمد عربی ﷺ جیسے داعی و مبلغ اور مربی و مزکی کی دس برس کی محنت کے نتیجے میں سوسوا سو آدمی جمع ہوئے۔ اس کے بعد پھر راستے کھلے ہیں۔ جو آپؐ کے دامن سے وابستہ ہوئے انہیں پھر جوڑا ہے، بیعت لی ہے، مربوط بنایا

ہے، منظّم کیا ہے، ان کی تربیت کی ہے اور مسلح تصادم کے مرحلے سے پہلے انہیں صبر محض کے مرحلے سے گزارا ہے۔ مکہ میں بارہ برس تک یہی حکم تھا کہ تشدد برداشت کرو۔ اگر مشرکین تمہیں ماریں تو مار سہو، جھیلو، لیکن جوابی کارروائی نہ کرو! اگر تمہارے ٹکڑے اڑا دیں تب بھی ہاتھ نہیں اٹھانا، تمہیں زندہ جلا دیں تب بھی ہاتھ نہیں اٹھانا۔ جب تک کہ اس کی اجازت نہ آجائے اُس وقت تک کوئی بدلہ نہیں، کوئی retaliation نہیں، حتیٰ کہ اپنے دفاع میں بھی ہاتھ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ اسی کو اقبال نے کہا ہے کہ ع ''با نشہ درویشی درساز و دمادم زن!'' دعوت دیئے جاؤ، تبلیغ کیے جاؤ، اپنی تربیت اور تزکیہ کرتے جاؤ، اپنے نظم کی پابندی کے خوگر بنتے چلے جاؤ، اپنی قوت بڑھاتے چلے جاؤ، لوگوں کی باتیں سنو اور برداشت کرو، گالیاں سنو اور دعائیں دو، تم پر پتھراؤ ہو تو تم پھول پیش کرو، تا آنکہ اتنی طاقت پیدا ہو جائے کہ اب کھلم کھلا اپنے آپ کو مقابلے کے قابل محسوس کرو۔ ع ''چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!'' پھر اپنے آپ کو سلطنتِ جم پر دے مارو۔ اسلام کا نظام ہمیشہ کے لیے خانقاہی نظام نہیں ہے کہ نسلاً بعد نسلٍ تربیت اور تزکیہ ہی کرتے رہو۔ جو کام ایک شیخ نے شروع کیا اسی کو ان کے بعد ان کے خلیفہ، پھر ان کے خلیفہ اور پھر ان کے خلیفہ کرتے چلے جاتے ہیں۔ خلیفہ در خلیفہ ایک ہی کام چل رہا ہے۔ یہ تربیت و تزکیہ آخر کس کام کا؟ اس تربیت و تزکیہ اور تعلیم و تلقین سے مقصود تو یہ ہونا چاہیے کہ طاقت فراہم کر کے پھر باطل سے ٹکرانا ہے۔

با نشۂ درویشی در ساز و دمادم زن
چوں پختہ شوی خود را بر سلطنتِ جم زن!

موجودہ حالات میں
اسلامی انقلاب کے لیے اقدام کی صورت

فرض کیجیے کہ اللہ تعالیٰ ہمیں توفیق دیتا ہے اور ہم اپنی جگہ اللہ کی بندگی کا فیصلہ کرتے ہیں اور پھر دعوت و تنظیم اور تربیت وغیرہ جیسے مراحل بھی اس حد تک طے ہو جاتے ہیں کہ دو لاکھ تربیت یافتہ افراد تیار ہو جاتے ہیں تو پاکستان جیسے ملک میں اقدام کی کیا شکل ہوگی؟ میرے نزدیک بارہ کروڑ کی آبادی کے اِس ملک کا نظام بدلنے کے لیے یہ کم سے کم تعداد ہے کہ دو لاکھ افراد ہی ان مراحل سے گزر چکے ہوں۔ وہ صرف نام کے نہیں بلکہ فی الواقع اللہ کے بندے ہوں' اپنی ذات پر اور اپنے گھر میں اللہ کے دین کو اور اس کی شریعت کو نافذ کر چکے ہوں۔ پھر وہ تربیت یافتہ ہوں' مضبوط ہوں' منظّم ہوں۔ ایک امیر کا حکم مان کر سر بکف ہو کر میدان میں آنے کو تیار ہوں۔ ان کے لیے شہادت کی موت اس زندگی سے کہیں زیادہ پسندیدہ ہو تو نظامِ باطل پر آخری حملہ کس طور سے ہوگا؟

سیرت النبی ﷺ میں تو ہمیں یہ آخری اقدام قتال کی شکل میں ملتا ہے کہ میدانِ جنگ میں آ ؤ' باطل کو للکارو' تلواریں تلواروں سے ٹکرائیں اور سر تن سے جدا ہوں' جس طرح غزوۂ بدر اور غزوۂ احد میں ہوا۔ بدر میں اگر ستر کافر مارے گئے تو تیرہ صحابہؓ بھی موقع پر شہید ہوئے' جبکہ میدان جنگ میں زخمی ہونے والے ایک صحابیؓ کا واپس مدینہ جاتے ہوئے انتقال ہو گیا۔ اس طرح چودہ صحابہؓ شہید ہوئے۔ اور اُحد میں صحابہؓ کی ایک غلطی سے معاملہ برعکس ہو گیا اور ستر صحابہؓ شہید ہو گئے' جن میں حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ بھی تھے اور حضرت مصعب بن عمیر رضی اللہ عنہ بھی۔ بہر حال وہاں جو آخری معاملہ تھا وہ قتال اور جنگ کا تھا......لیکن یہاں اقدام کی صورت کیا ہو؟ اس کے لیے یہاں اجتہاد کی ضرورت ہے اور دنیا میں اجتہاد صرف وہاں کیا جا سکتا ہے جہاں نئی صورتحال پیدا ہو گئی ہو۔ اگر تو حالات وہی ہوں جو حضور ﷺ کے زمانے میں تھے تو پھر اجتہاد کی کیا ضرورت ہے؟

اجتہاد کر کے خواہ مخواہ کا خطرہ (risk) کیوں مول لیا جائے؟ اجتہاد میں خطا بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی بڑے سے بڑا مجتہد اس بات کا دعویدار نہیں ہے کہ ہم سے خطا نہیں ہو سکتی' نہ امام ابو حنیفہ' نہ امام مالک' نہ امام شافعی' نہ امام احمد بن حنبل رحمہم اللہ۔ ہمارے ہاں اصول یہ ہے کہ ''قَولُ اصحابِنا صواب محتمل الخطأ وقول غیرنا خطأ محتمل الصواب'' یعنی ''ہمارا موقف درست ہے لیکن اس میں خطا کا امکان ہے اور دوسروں کا موقف غلط ہے لیکن امکان ہے کہ وہی صحیح ہو''۔ تو اجتہاد میں بہر حال خطا کا امکان موجود ہے۔ اس سلسلے میں یہ بھی اصول ہے کہ مجتہد سے اگر خطا ہو گئی ہو تب بھی اسے اکہرا ثواب ملے گا اور اگر وہ صحیح رائے تک پہنچ گیا تو اسے دہرا ثواب ملے گا۔ لیکن ظاہر بات ہے کہ خطا کا ''رِسک'' وہیں لیا جائے گا جہاں صورتحال نئی ہے۔ تو دیکھنا یہ ہے کہ کیا واقعتاً ہمارے ہاں صورتحال نئی ہے؟ اور اگر ہے تو کس کس اعتبار سے؟

میرا دعویٰ یہ ہے کہ ہمارے ہاں صورتحال واقعتاً کئی اعتبارات سے نئی ہے۔ ایک تو یہ کہ وہاں معاملہ اس اعتبار سے سیدھا سیدھا تھا کہ ایک طرف اہل ایمان تھے اور ایک طرف کفار۔ لیکن آج باطل نظام کے پشت پناہ حکمران بھی مسلمان ہیں اور اسلامی نظام کے قیام کے لیے جدوجہد کرنے والے بھی مسلمان۔ چنانچہ حسنی مبارک ہوں یا یاسر عرفات' اور شاہ فہد ہوں یا بے نظیر بھٹو' سب کلمہ گو مسلمان ہیں۔ دوسری طرف اسلام کے لیے کام کرنے والے خواہ صوفی محمد ہوں یا کوئی اور ہوں وہ بھی مسلمان ہیں۔ قانونی اعتبار سے تو یہاں مسلمان مسلمان کے مقابلے میں ہے۔ دوسرے یہ کہ رسول اللہ ﷺ کی جدوجہد کے وقت عرب میں ملکی سطح پر کوئی مستحکم حکومت نہیں تھی۔ تھوڑی بہت حکومت نام کی شے صرف مکہ میں تھی کہ وہاں ایک ہی قبیلہ آباد تھا جس کی پارلیمنٹ ''دارالندوہ'' کے نام سے تھی اور کچھ مناصب بھی تھے۔ باقی پورے عرب میں نہ تو کوئی حکومت تھی' نہ کوئی نظام تھا' نہ باقاعدہ فوجیں (standing armies) تھیں۔ والنٹیئرز (رضا کاروں) کا مقابلہ والنٹیئرز سے تھا۔ مکہ سے چل کر جو ایک ہزار کفار میدان بدر میں آئے تھے وہ بھی رضا کار ہی تھے' وہ کوئی باقاعدہ فوج نہیں تھی اور ادھر سے جو تین سو تیرہ تھے وہ بھی رضا کار

ہی تھے۔ پھر تین سو تیرہ کے مقابلے میں ایک ہزار کی تعداد گویا تین گنا تھی اور اسلحہ کا جو فرق تھا وہ آپ ایک کے مقابلے میں دس نہیں تو بیس شمار کر لیں' زیادہ سے زیادہ سو شمار کر لیں' اس سے زیادہ فرق تو نہیں تھا! لیکن آج کیا ہے؟ آج آپ شاہ فہد کے خلاف ذرا کوئی تحریک چلا کر دیکھئے' پوری حکومت' اسلحہ کے انبار رکھنے والی بری افواج اور فضائیہ' یہ ساری کی ساری آپ کو کچل کر رکھ دیں گی۔ ہیلی کاپٹر تو یہاں مالاکنڈ میں بھی استعمال ہو گیا تھا۔ معاملہ ذرا سا طول کھینچ جاتا تو کیا ایئر فورس استعمال نہ ہوتی؟ بلوچستان میں اگرچہ دوسرا جھگڑا تھا' لیکن چونکہ بہرحال اختلاف کا معاملہ تھا' لہٰذا ایئر فورس استعمال ہوئی تھی۔ حافظ الاسد نے الاخوان المسلمون کے خلاف ایئر فورس استعمال کی تھی اور پورا شہر تہس نہس کر کے رکھ دیا تھا۔ اس اعتبار سے یہ معاملہ قابل عمل نہیں ہے۔ تو اس کا متبادل کیا ہے؟

موجودہ حالات میں اس ضمن میں اجتہاد کی ایک مثال ایرانیوں نے پیش کر دی ہے اور ہمیں حق بات کو قبول کرنا چاہیے خواہ وہ کہیں سے ملے۔ حدیث نبویؐ ہے: ((اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ ھُوَاَحَقُّ بِھَا حَیْثُ وَجَدَھَا)) یعنی ''حکمت مومن کی متاعِ گم گشتہ ہے' پس وہ اسے جہاں بھی پائے اس کا زیادہ حقدار ہے''۔ چنانچہ حق بات یا دانائی کی بات جہاں سے ملے لے لو۔ چین سے ملے' چین سے لے لو۔ اس صدی میں گاندھی پہلے نمبر پر ہے جس نے عدم تشدد کی تحریک کے ساتھ اس ملک سے انگریز کی جڑیں ڈھیلی کیں۔ اگرچہ اس کے اور اسباب بھی تھے' صرف کانگریس اور مسلم لیگ کی جدوجہد سے یہ ملک آزاد نہیں ہوا' لیکن بہرحال ایک مثال گاندھی نے پیش کی تھی کہ اس نے اس ملک میں عدم تشدد کے ساتھ ایک عوامی تحریک چلائی' یہاں تک کہ چورا چوری کا واقعہ پیش آ گیا۔ یعنی ایک موقع پر ایک جلوس پر پولیس نے زیادتی کی تو جلوس نے مشتعل ہو کر پولیس اسٹیشن پر حملہ کر کے شاید تیس سپاہی مار دیئے تھے۔ اس پر گاندھی نے اپنی پوری تحریک یہ کہہ کر ختم کر دی تھی کہ اگر تم عدم تشدد پر کاربند نہیں رہ سکتے تو میں تمہاری قیادت نہیں کر سکتا۔ تو چاہے گاندھی ہو چاہے خمینی ہو' اگر کوئی بات صحیح ہے تو ہم اس سے لے لیں

گے۔ آخر غزوۂ خندق کے موقع پر رسول اللہ ﷺ نے خندق کھودنے کی تجویز کس کی قبول کی تھی؟ وہ تو ایرانیوں کا طریقہ تھا۔ اس موقع پر حضرت سلمان فارسی رضی اللہ عنہ نے مشورہ دیا تھا کہ جب ایران میں ایسی صورتحال درپیش ہوتی ہے تو ہم شہر کی حفاظت کے لیے خندق کھودتے ہیں۔ رسول اللہ ﷺ نے اس تجویز کو پسند فرمایا اور خندق کھود لی گئی حالانکہ اُس زمانے میں نہ عرب میں اس کا رواج تھا نہ حضور ﷺ کے ذہن میں خندق کی تجویز آئی تھی۔ تو آنحضور ﷺ کے ارشاد ((اَلْحِکْمَۃُ ضَالَّۃُ الْمُؤْمِنِ ھُوَاَحَقُّ بِھَا حَیْثُ وَجَدَھَا)) کے حوالے سے ہمیں حق بات جہاں سے بھی ملے گی اسے قبول کریں گے۔

اس حوالے سے اگر منظّم اور تربیت یافتہ افراد کی معتدبہ تعداد جمع ہو جائے' بالفاظِ دیگر مطلوبہ افرادی طاقت فراہم ہو جائے تو اب انقلاب کا لائحہ عمل کیا ہو گا؟ الحمدللہ میں مطمئن ہوں کہ اس کا بھی میں نے الف سے لے کر یا تک پورا نقشہ قرآن اور سنت و سیرتِ نبویؐ سے اخذ کیا ہے' جو میں آپ کے سامنے پیش کرتا ہوں۔ ''نہی عن المنکر''، یعنی ''برائی سے روکنا'' قرآن و حدیث کی اصطلاح ہے۔ حدیث نبویؐ میں اس کے تین درجے بیان ہوئے ہیں: (۱) طاقت سے روکنا' (۲) زبان سے روکنا' (۳) دل سے نفرت کرنا۔ چنانچہ حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((مَنْ رَءٰی مِنْکُمْ مُنْکَراً فَلْیُغَیِّرْہُ بِیَدِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِلِسَانِہٖ' فَاِنْ لَّمْ یَسْتَطِعْ فَبِقَلْبِہٖ' وَذٰلِکَ اَضْعَفُ الْاِیْمَانِ)) (رواہ مسلم)

''تم میں سے جو شخص کسی برائی کو دیکھے اس کا فرض ہے کہ اسے اپنے زورِ بازو سے روکے۔ اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے روکے۔ اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو دل سے (نفرت کرے) اور یہ ایمان کا کمزور ترین درجہ ہے۔''

جو لوگ اس کام کو اوّل درجے میں کرنے کے لیے آئیں گے' وہ بھی ظاہر ہے کہ دل میں تو برائی کے خلاف نفرت رکھتے ہوں گے' تب ہی تو آئیں گے۔ اپنے دھندے چھوڑیں گے' اپنی دنیا کو سکیڑیں گے۔ وہ اسی لیے آئیں گے کہ انہیں بدی سے نفرت ہے

اور وہ نیکی کا پرچار کرنا چاہتے ہیں‘ نیکی کا غلبہ چاہتے ہیں۔

دوسرے درجے میں‘ جب تک طاقت فراہم نہیں ہوتی‘ برائی کے خلاف دل سے نفرت کے ساتھ ساتھ زبان اور قلم سے برائی کے خلاف آواز اٹھائیے۔ برائی کی نشاندہی کر کے کہیے کہ خدارا یہ کام چھوڑ دو‘ باز آ جاؤ۔ یہ عریانی ترک کر دو‘ یہ بے پردگی ختم کرو‘ یہ فحاشی چھوڑ دو! اخبار والوں کے سامنے جا کر ہاتھ جوڑیئے‘ مظاہرے کیجیے کہ یہ تم جو ہر روز عورتوں کی رنگین تصویریں ہر گھر میں پہنچا رہے ہو‘ اس سے تمہیں ملتا کیا ہے؟ اس ذریعے سے تم نے قوم کے اخلاق کا کتنا ستیاناس کیا ہے! آج یہ بدبخت آپ کی اور میری بچیوں کے لیے فلمی اداکاراؤں اور رقاصاؤں کو اسوہ کے طور پر پیش کر رہے ہیں۔ ان کے کردار کو جس طریقے سے اچھالا جا رہا ہے اور ان کی تصاویر کی جس طرح نمائش ہو رہی ہے اس سے کیا ہر بچی کے دل میں یہ امنگ پیدا نہیں ہو گی کہ میں بھی ویسی بن جاؤں‘ میرا بھی تذکرہ ہو‘ میرا بھی چرچا ہو‘ اخبارات میں میرا نام بھی آئے؟ عام آدمی کتنے ہوں گے جو اس وبا سے بچ جائیں؟ تو ان سے کہو‘ ہاتھ جوڑو‘ خوشامد کرو کہ باز آ جاؤ‘ اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت مت دو! لیکن جب طاقت فراہم ہو جائے گی تو ان کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے کہ ہم یہ نہیں ہونے دیں گے‘ اب یہ اخبار نہیں چھپے گا! طے کرو کہ یہ چیز نہیں ہو گی تو پھر چھپنے دیں گے۔ اسی طرح سود کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے کہ اب یہ سودی کاروبار نہیں ہو گا! بینکوں کا گھیراؤ کریں گے‘ پکٹنگ (picketing) کریں گے۔ اگر گولیاں چلیں گی تو سینے حاضر کر دیں گے۔ ایران میں بھی لوگوں نے گولیاں کھائی ہیں‘ جانیں دی ہیں‘ تب نظام بدلا ہے۔ اس کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ دو لاکھ منظّم افراد سر سے کفن باندھے ہوئے نکلیں کہ خواہ ہم پر گولیاں چلاؤ‘ ہمیں جیلوں کے اندر بھر دو‘ ہمیں معذور کر دو‘ ہمارے بازو اور ہماری ٹانگیں شل کر دو‘ لیکن اب ہمارے قدم پیچھے نہیں ہٹیں گے۔ یہ ہے ہمارے پیش نظر ”نهي عن المنكر باليد“ کے طور پر اقدام کا آخری مرحلہ۔ لیکن یہ اقدام یکطرفہ ہو گا۔ انقلابی جماعت کے کارکن خود جانیں دیں گے لیکن ان کے ہاتھوں کسی کی جان کو نقصان نہیں پہنچے گا۔

ہمارے نزدیک دہشت گردی قطعاً حرام ہے‘ چاہے وہ الجزائر میں مسلم فنڈامنٹلسٹ کر رہے ہوں یا مصر میں جماعہ اسلامیہ کر رہی ہو۔ ویسے ان کا کہنا یہ ہے کہ دہشت گردی وہ نہیں کر رہے ہیں بلکہ درحقیقت ان پر الزام دھرنے کے لیے حکومت کے ایجنٹ کرتے ہیں۔ لیکن اگر خدانخواستہ وہ کر رہے ہیں تو حرام کام کر رہے ہیں۔ جو شخص سیاح کی حیثیت سے آپ کے ملک میں آیا ہوا ہے اس کا کیا گناہ ہے کہ آپ نے بم مار کر اس کی بس اڑا دی؟ اس طرح بے گناہوں کو مار دینا تو کوئی طریقہ نہیں۔ اصل طریقہ یہ ہے کہ کسی کی جان کو‘ کسی کے مال کو کوئی نقصان نہ پہنچاؤ‘ ہاں اپنی جانیں دینے کو تیار ہو جاؤ!

شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مؤمن
نہ مالِ غنیمت‘ نہ کشور کشائی

اقامتِ دین کی جدوجہد کے نتائج

اگر اللہ تعالیٰ یہ جدوجہد کرنے کے لیے آپ کا دل کھول دے‘ آپ کو انشراحِ صدر ہو جائے اور اگر فرض کیجیے اس جدوجہد میں معتد بہ تعداد میں لوگ شامل ہو جائیں تو جاننا چاہیے کہ کن نتائج کی توقع ہے۔

(۱) فلاحِ آخرت

اس کا پہلا نتیجہ‘ جو کہ اصل نتیجہ ہے‘ یہ نکلے گا کہ چاہے دنیا میں کامیابی حاصل ہو یا نہ ہو‘ جو شخص بھی اس جدوجہد میں اپنی زندگی بتا دے گا اس کی آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔ اور اگر اصل زندگی آخرت کی ہے‘ اور یقیناً ہے‘ تو اصل کامیابی بھی وہی ہے۔ قرآن مجید میں یوم محشر کو ”یوم التغابن“ بھی کہا گیا ہے‘ یعنی ”ہار اور جیت کا دن“۔ جو اُس دن ناکام ہوا وہی اصل میں ناکام و نامراد ہے اور جو اس دن کامیاب ہوا وہی درحقیقت کامیاب ہے۔ چنانچہ انقلاب آئے نہ آئے‘ نظام بدلے نہ بدلے‘ اگر یہی جدوجہد کرتے ہوئے‘ اپنے فرائض ادا کرتے ہوئے اللہ کے حضور حاضری ہو گئی تو چاہے شہادت کی موت نصیب ہو چاہے ویسے طبعی موت آئے‘ آخرت میں یقیناً نجات مل جائے گی۔ حضرت

یاسر اور حضرت سمیہ (رضی اللہ عنہما) دونوں مکہ ہی میں شہید کر دیے گئے تھے‘ اور انہوں نے فتح مکہ اور غلبۂ اسلام کا منظر اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا‘ تو کیا وہ‘ معاذ اللہ‘ ناکام شمار ہوں گے؟ اس سے آگے بڑھئے‘ کیا حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ اس دنیا سے‘ معاذ اللہ‘ ناکام گئے؟ انہوں نے اسی جدوجہد میں اپنی جان دے دی‘ جامِ شہادت نوش کر لیا‘ اور کامیاب ہو گئے‘ حالانکہ انہوں نے بھی وہ رُوح پرور منظر نہیں دیکھا جب دس ہزار قدوسیوں کے جلو میں محمدٌ رسول اللہ ﷺ فاتح کی حیثیت سے مکہ میں داخل ہوئے۔ لیکن اس منظر کو پیدا کرنے کے لیے حضرت حمزہ رضی اللہ عنہ کی ہڈیوں کا چورا اس کی بنیاد میں پڑا ہے۔ وہ گارا اُحد کے شہداء کے خون اور ہڈیوں سے گوندھا گیا تھا جس سے وہ عمارت تعمیر ہوئی۔ لہٰذا پہلی بات جو یقینی (guaranteed) ہے وہ یہ ہے کہ دنیا میں خواہ کامیابی ہو یا نہ ہو‘ آخرت کی کامیابی یقینی ہے۔

(۲) غلبۂ اسلام کا امکان

اور کیا عجب کہ اللہ تعالیٰ ﴿وَاُخْرٰی تُحِبُّوْنَھَا﴾ کے مصداق دنیا میں بھی اس جدوجہد کو کامیابی سے ہمکنار کر دے۔ سورۃ الاعراف میں بڑا پیارا مضمون وارد ہوا ہے کہ جب یہود کے ایک قبیلہ نے احکامِ سبت کی خلاف ورزی کی تو اُس وقت قوم تین حصوں میں تقسیم ہو گئی۔ ایک تو وہ تھے جو اللہ کا قانون توڑ رہے تھے۔ دوسرے وہ تھے جو اسے توڑ نہیں رہے تھے لیکن توڑنے والوں کو روک بھی نہیں رہے تھے۔ اور تیسرے وہ تھے جو از خود بھی بچے ہوئے تھے اور دوسروں کو بھی اپنی آخری حد تک روک رہے تھے۔ درمیانی قسم کے لوگوں نے‘ جو سبت کے قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کو روک نہیں رہے تھے لیکن خود بھی اس گناہ میں ملوث نہیں تھے‘ ان لوگوں سے کہا جو نہی عن المنکر کرنے والے تھے: ﴿لِمَ تَعِظُوْنَ قَوْمَا ۨ اللّٰهُ مُهْلِكُهُمْ اَوْ مُعَذِّبُهُمْ عَذَابًا شَدِيْدًا ؕ﴾ یعنی ”تم ایسی قوم کو کس لیے نصیحت کر رہے ہو جن کو اب اللہ ہلاک کر کے چھوڑے گا یا ان کو شدید عذاب دے گا“۔ یہ ماننے والے تو ہیں نہیں‘ تم اپنے آپ کو ہلکان نہ کرو‘ اپنا وقت ضائع نہ کرو۔ اس پر ان کا جواب تھا: ﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ ہم تمہارے رب کے سامنے عذر تو پیش کر

سکیں گے نا کہ اے اللہ ہم تو اپنے آخری وقت تک ان کو اس بدی سے روکتے رہے۔ اور دوسری بات یہ کہ: ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ ۝١٦٤﴾ اور کیا پتا ان کے اندر تقویٰ پیدا ہو ہی جائے۔ ہم مستقبل کے بارے میں کیا کہہ سکتے ہیں‘ ہم نے کسی کے دل کے اندر اتر کر تو دیکھا نہیں ہے‘ کیا پتہ اللہ ان کے دلوں کو بدل دے اور ان کے لیے ہدایت کے راستے کھل جائیں۔

چنانچہ اگر یہ زندگی اِس جدوجہد میں کھپ گئی ہے‘ اگر میں نے اپنی بہتر اور بیشتر توانائیاں اور صلاحیتیں اس کام میں لگا دی ہیں تو ﴿مَعْذِرَةً اِلٰى رَبِّكُمْ﴾ کا تقاضا تو پورا ہو گیا اور مجھے اُمید واثق ہے کہ میں اللہ کے یہاں سرخرو اور کامیاب ہوں گا۔ اور سب سے بڑی اور اصل کامیابی یہی ہے ﴿ذٰلِكَ هُوَ الْفَوْزُ الْمُبِيْنُ ۝٣٠﴾ (الجاثیۃ)۔ لیکن دوسرے درجے میں کیا بعید ہے کہ اللہ تعالیٰ ﴿وَلَعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ﴾ والی صورت بھی پیدا فرما دے‘ کیا عجب کہ دنیا میں بھی کامیابی ہو جائے۔ اس حوالہ سے تصویر کا دوسرا رخ بڑے اختصار کے ساتھ آپ کے سامنے رکھوں گا۔

احادیثِ مبارکہ میں حضور ﷺ کی واضح پیشین گوئیاں ہیں کہ قیامت سے قبل اس پورے کرۂ ارض پر اللہ کا دین غالب ہو کر رہے گا۔ میں نے بارہا کہا ہے کہ میں یہ کبھی نہ مانتا کہ ایسا ہو سکتا ہے اگر حضور ﷺ نے نہ فرمایا ہوتا۔ جب حضور ﷺ سے پہلے کسی نبیؑ کے ہاتھوں میں ایسا نہیں ہوا تو اب جبکہ ختم نبوت و تکمیل رسالت کے تقاضے کے طور پر کوئی نبی آئے گا نہ کوئی رسول‘ تو یہ کام مجھ جیسے ناقص و ناکارہ قسم کے قائدین کے ذریعے کیسے ہو جائے گا؟ لیکن ماننا پڑتا ہے کہ ایسا ہو کر رہے گا‘ کیونکہ اس کی خبر دی ہے الصادق والمصدوق محمدٌ رسول اللہ ﷺ نے۔ حضرت مقداد بن اسود رضی اللہ عنہ بیان کرتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا:

لَا يَبْقٰى عَلٰى ظَهْرِ الْاَرْضِ بَيْتُ مَدَرٍ وَلَا وَبَرٍ اِلَّا اَدْخَلَهُ اللّٰهُ كَلِمَةَ الْاِسْلَامِ بِعِزِّ عَزِيْزٍ وَذُلِّ ذَلِيْلٍ، اِمَّا يُعِزُّهُمُ اللّٰهُ فَيَجْعَلُهُمْ مِنْ اَهْلِهَا وَاِمَّا يُذِلُّهُمْ فَيَدِيْنُوْنَ لَهَا (رواہ احمد)

''روئے ارضی پر نہ کوئی اینٹ گارے کا بنا ہوا گھر باقی بچے گا اور نہ کوئی اونٹ کے بالوں سے بنا ہوا خیمہ مگر اللہ اس میں کلمۂ اسلام کو داخل کرے گا' خواہ کسی عزت والے کے اعزاز کے ساتھ خواہ کسی مغلوب کی مغلوبیت کی صورت میں۔ یعنی یا لوگ اسلام قبول کر کے خود ہی عزت کے مستحق بن جائیں گے یا اسلام کی بالادستی تسلیم کر کے اس کی تابعداری قبول کرنے پر مجبور ہو جائیں گے!''

جو خود ایمان لے آئے گا اس کے گھر میں اسلام داخل ہو گا تو اسے بھی اعزاز نصیب ہو گا کیونکہ ﴿وَلِلّٰہِ الْعِزَّۃُ وَلِرَسُوْلِہٖ وَلِلْمُؤْمِنِیْنَ﴾ (المنفقون:۸) ''عزت تو اللہ کے لیے' اس کے رسول ﷺ کے لیے اور اہلِ ایمان کے لیے ہے''۔ اور جو ایمان نہیں لائے گا اسے بھی اسلام کی بالادستی کو تسلیم کرنا ہو گا اور وہ خود چھوٹا ہو کر رہے گا اور جزیہ ادا کرے گا۔ تو گویا اس کے گھر میں بھی اسلام آ گیا' وہ بدبخت خود محروم رہ گیا۔

صحیح مسلم میں حضرت ثوبان رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا:

((اِنَّ اللّٰہَ زَوٰی لِیَ الْاَرْضَ فَرَاَیْتُ مَشَارِقَھَا وَمَغَارِبَھَا' وَاِنَّ اُمَّتِیْ سَیَبْلُغُ مُلْکُھَا مَا زُوِیَ لِیْ مِنْھَا))

''اللہ نے مجھے پوری زمین کو لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھا دیا۔ چنانچہ میں نے اس کے سارے مشرق بھی دیکھ لیے اور تمام مغرب بھی۔ اور یقین رکھو کہ میری امت کی حکومت ان تمام علاقوں پر قائم ہو گی جو مجھے لپیٹ کر (یا سکیڑ کر) دکھائے گئے۔''

یہ دو احادیث اور اس مضمون کی دیگر احادیث کے بعد مجھے قطعاً کوئی شک نہیں ہے کہ دینِ اسلام کا غلبہ اس کرۂ ارضی پر ہو کر رہنا ہے۔ مزید برآں قرآن حکیم میں منطق کے اس قضیے کے صغریٰ اور کبریٰ دونوں بہ تکرار و اعادہ وارد ہوئے ہیں جس کا لازمی نتیجہ دینِ حق کا عالمی غلبہ ہے۔ چنانچہ قرآن مجید میں تین بار (التوبہ: ۳۳' الفتح: ۲۸ اور الصّف: ۹) یہ الفاظ وارد ہوئے ہیں:

﴿ھُوَ الَّذِیْٓ اَرْسَلَ رَسُوْلَہٗ بِالْھُدٰی وَدِیْنِ الْحَقِّ لِیُظْھِرَہٗ عَلَی الدِّیْنِ کُلِّہٖ﴾

''وہی ہے (اللہ) جس نے بھیجا اپنے رسول (محمد ﷺ) کو الھدیٰ (قرآن حکیم) اور دین حق (اسلام) دے کر تا کہ غالب کر دے اسے کُل کے کُل دین (نظامِ زندگی) پر!''

یہ گویا اس قضیے کا صغریٰ ہے' اور کبریٰ یہ ہے کہ آنحضور ﷺ کی بعثت پوری نوعِ انسانی اور کُل عالمِ انسانیت کی جانب ہے۔ از روئے الفاظ قرآنی: ﴿وَمَآ اَرْسَلْنٰکَ اِلَّا کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیْرًا وَّنَذِیْرًا﴾ (سبا:۲۸) یعنی ''ہم نے نہیں بھیجا ہے (اے نبی ﷺ) آپ کو مگر تمام انسانوں کے لیے بشیر اور نذیر بنا کر''...... اب صغریٰ اور کبریٰ کو جمع کر لیجیے تو یہ لازمی اور منطقی نتیجہ برآمد ہو جاتا ہے کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت بہ تمام و کمال اسی وقت مکمل ہو گا جب تمام عالمِ انسانی یعنی کُل روئے ارضی پر اللہ کا دین غالب ہو جائے گا اور کیسے ممکن ہے کہ حضور ﷺ کا مقصدِ بعثت پایۂ تکمیل کو نہ پہنچے اور یہ دنیا ختم ہو جائے' جبکہ دینِ محمد ﷺ کا پورے عالمِ انسانیت پر غلبہ ابھی باقی ہے۔ گویا بقول اقبال:

وقتِ فرصت ہے کہاں کام ابھی باقی ہے
نورِ توحید کا اِتمام ابھی باقی ہے!

چنانچہ قرآن و حدیث کی راہنمائی میں پورے وثوق اور صدفی صد یقین سے یہ بات کہہ رہا ہوں کہ قیامت سے قبل دینِ اسلام کا عالمی غلبہ ہو کر رہے گا۔

(۳) پاکستان کی بقا و سالمیت

اس حقیقت کا دوسرا پہلو بھی بہت اہم ہے۔ اگرچہ اس ضمن میں مجھے اس درجے وثوق تو حاصل نہیں ہے لیکن ظنِ غالب کے درجے میں یہ بات کہہ رہا ہوں کہ مجھے ایسے محسوس ہوتا ہے کہ پاکستان کا یہ خطہ جس میں میں اور آپ آباد ہیں' یہ خطہ اللہ کی مشیت میں اس کام کے لیے منتخب ہو چکا ہے۔ بعض ٹھوس شواہد کی بنیاد پر میرا گمانِ غالب ہے کہ دینِ حق کے لیے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز ہمارا یہی خطہ بنے گا جیسے رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں اِس کام کا آغاز سرزمینِ عرب سے ہوا تھا اور پھر یہ خلافتِ راشدہ کے دوران شمال میں کوہ قاف تک' مشرق میں دریائے جیحوں تک اور مغرب میں بحر اوقیانوس کے ساحل تک پہنچ گیا۔ اسی طرح قرائن یہ بتا رہے ہیں کہ اب نظام خلافت کے احیاء کے کام کا آغاز ان شاء اللہ العزیز افغانستان اور پاکستان پر مشتمل اس خطۂ ارضی سے ہو گا۔ اس لیے کہ چار سو برس سے سارے مجدد دینِ امت اسی خطے میں پیدا ہوئے ہیں۔

امت کی تاریخ میں پہلے ایک ہزار برس تک سارے کے سارے مجددین عالمِ عرب میں پیدا ہوئے۔ عمر بن عبدالعزیز، امام ابوحنیفہ، امام احمد بن حنبل، شیخ عبدالقادر جیلانی، امام ابن تیمیہ اور امام غزالی رحمۃ اللہ علیہم وغیرہم سب کے سب وہیں پیدا ہوئے۔ لیکن جیسے ہی پہلے ہزار برس ختم ہوئے اور گیارہویں صدی شروع ہوئی تو حضرت مجدد الف ثانی شیخ احمد سرہندیؒ ہندوستان میں پیدا ہوئے۔ اس کے بعد بارہویں صدی کے مجدد شاہ ولی اللہ دہلویؒ اور تیرھویں صدی کے مجدد سید احمد بریلویؒ بھی اسی سرزمین ہند میں پیدا ہوئے، جو بالاکوٹ میں شہید ہوئے۔ اس ہندوستان کی سرزمین پر پہلا خالص اسلامی جہاد تو وہ تھا کہ جو محمد بن قاسمؒ اور ان کے ساتھیوں نے کیا تھا۔ اس کے بعد جسے خالص اسلامی جہاد کہا جا سکتا ہے اور جو صحابہ کرامؓ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے ہوا ہے، وہ سید احمد بریلویؒ اور شاہ اسماعیل شہیدؒ کا جہاد ہے اور ان کے خون کی امین یہ سرزمین پاکستان ہے۔ پھر چودھویں صدی میں علامہ اقبال جیسا مفکر، مولانا مودودی جیسا مصنف، مولانا الیاس جیسا مبلغ اور شیخ الہند مولانا محمود حسن جیسا مجاہدِ حریت (رحمۃ اللہ علیہم)...... یہ سب کے سب یہیں پیدا ہوئے۔ ان کے ہم پلہ کوئی شخصیت آپ پورے عالم اسلام میں نہیں دکھا سکتے۔

یہ تو ماضی کے آثار ہیں اور اس کے بعد پاکستان کا قیام اس سلسلے کی بہت اہم کڑی ہے۔ دنیا میں یہ واحد ملک ہے جو اسلام کے نام پر بنا۔ پھر اس کا قیام بجائے خود ایک معجزہ ہے۔ قیام سے چند مہینے پہلے تک کوئی یہ توقع نہیں رکھتا تھا کہ پاکستان بن جائے گا۔ گاندھی جیسا لیڈر کہہ رہا تھا کہ پاکستان میری لاش پر بنے گا۔ پھر خود نہرو اور پٹیل لارڈ ماؤنٹ بیٹن کے پاس گئے اور جا کر کہا کہ ہم باپو جی سے ہندوستان کی تقسیم کی بات نہیں کر سکتے، آپ کسی طرح جا کر گاندھی جی کو اس پر آمادہ کیجیے، آپ ان کے چیلے ہیں۔ چنانچہ لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے جا کر گاندھی سے منوایا ہے ورنہ وہ ماننے پر تیار نہیں تھے۔ خود قائداعظم چند مہینے پہلے کیبنٹ مشن پلان کو تسلیم کر چکے تھے کہ مرکزی حکومت ایک ہوگی اور ملک کے تین زون ہوں گے لیکن اللہ نے کہا نہیں، یہ آزاد ملک لو! علامہ اقبال نے تو ایک خطے کا خواب دیکھا تھا، لیکن اللہ تعالیٰ نے ہمیں دو خطوں پر مشتمل ملک دے دیا۔

۱۹۳۰ء کے خطبہ الٰہ آباد میں علامہ اقبال نے صرف ''مغربی پاکستان'' کا تصور پیش کیا تھا، یعنی ہندوستان کے شمال مغرب میں ایک آزاد مسلم ریاست کا قیام۔ انہوں نے کہا تھا کہ میرے نزدیک یہ تقدیرِ مبرم (destiny) ہے، میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ ہو کر رہے گا۔

قیامِ پاکستان کے معجزے کے بعد پھر قراردادِ مقاصد کا پاس ہونا بھی ایک معجزہ ہے۔ بیسویں صدی عیسوی کے وسط میں دس کروڑ افراد کی قوم کی نمائندہ دستور ساز اسمبلی حاکمیت سے اپنی دستبرداری اور اللہ کی حاکمیت کا اعلان کر رہی تھی۔

سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اِک وہی باقی بتانِ آزری!

دستور ساز اسمبلی کی سطح پر یہ کلمۂ طیبہ کے پہلے جزو ''لا الٰہ الا اللہ'' کا اظہار و اعلان تھا۔ یہ سارے شواہد ہیں میرے اس گمان کے کہ یہ خطہ اسلام کے عالمی غلبے کا نقطۂ آغاز بنے گا۔ اب ضرورت ہے کمرِ ہمت کسنے کی اور اس مقصد کی طرف رجوع کرنے کی جس کی خاطر یہ ملک حاصل کیا گیا تھا۔ میں نے اپنی کتاب ''استحکامِ پاکستان'' میں دلائل سے ثابت کیا ہے کہ اس ملک کی بقا اور سالمیت کا انحصار بھی اسلام پر ہے۔ گویا اسلام اس ملک کا صرف مقصدِ وجود ہی نہیں اس کی واحد وجہِ جواز بھی ہے۔ اور اگر آپ نے اس منزل کی طرف رجوع نہ کیا تو یہ ملک باقی نہ رہے گا۔ میرے نزدیک اس ملک میں قیامِ اسلام کی بھرپور جدوجہد سے جہاں ہم پر اللہ کی طرف سے عائد کردہ وہ فرض ادا ہوگا جو اللہ کی رضا اور ہماری آخرت کی نجات کا باعث بنے گا وہاں ہم دنیا کے سامنے اسلام کے نظامِ عدل و قسط کا کوئی نمونہ بھی پیش کر سکیں گے اور اس طرح اس اُمت کے اوپر جو عذاب کے سائے منڈلا رہے ہیں وہ دور ہو جائیں گے۔ ہم دنیا کے سامنے پاکستان کی صورت میں اسلام کی تصویر اور اسلام کا نقشہ پیش کر سکیں گے، اور یہی وہ شے ہے جو امت پر سے بحیثیت مجموعی عذابِ خداوندی کو ٹالنے والی ہے۔ اگر یہ نہیں ہوگا تو عذاب شدید سے شدید تر ہوگا۔ مزید برآں یہ ملک اپنے مقصدِ وجود کو پا لے گا تو مستحکم اور طاقتور ہوگا، اور اس کے نتیجے میں اس قوم کے اندر وہ جذبہ ابھر آئے گا کہ کوئی امریکہ کیا امریکہ کا باپ بھی

مقابلے پر سامنے نہیں آ سکے گا۔ لیکن اگر یہاں وہ جذبہ نہیں ابھرتا تو پھر جان لیجیے کہ اس ملک کے حصے بخرے ہوا چاہتے ہیں۔

الٰہی خیر میرے آشیاں کی
زمیں پر ہیں نگاہیں آسماں کی

پہلے تو یہ ۱۹۷۱ء میں دولخت ہوا تھا۔ اب نہ معلوم کتنے مزید ٹکڑے ہوں۔ اب کیا پتہ کہ آپ کا آزاد کشمیر چھین کر اسے خود مختار کشمیر میں شامل کر دیا جائے۔ دوسرے یہ کہ شمالی علاقوں میں کوئی اسماعیلی ریاست قائم ہو جائے۔ تیسرے کہ کراچی کو کاٹ کر سنگاپور یا ہانگ کانگ کی طرح کا علیحدہ خطہ بنا دیا جائے۔ آخر کوئی وجہ تو ہے کہ بے نظیر شدت کے ساتھ اس کی تردید میں بیانات دے رہی ہیں کہ ہم نہیں بننے دیں گے۔ ہمارے سیاست دان ''نہیں بننے دیں گے'' کے الفاظ اسی وقت کہتے ہیں جب انہیں کوئی شے بنتی نظر آ رہی ہو۔ ایک وقت میں یہ کہا گیا تھا کہ ہم بنگلہ دیش نہیں بننے دیں گے۔ اُس وقت یہ اُس دور کے بڑے بڑے سیاست دانوں نے کہا تھا۔ لیکن کیا نتیجہ نکلا؟ جب ہم نے بحیثیت قوم اپنی روش تبدیل نہیں کی اور اللہ کے ساتھ بدعہدی جاری رکھی تو اللہ کی طرف سے وہ سزا ملی کہ ہمارے ترانوے ہزار افراد' جن میں سے تینتالیس ہزار فوجی اور باقی سویلین تھے' اس ہندو کے قیدی بنے جس پر ہم نے کہیں آٹھ سو برس' کہیں چھ سو برس اور کہیں ہزار برس تک حکومت کی تھی۔ تو یہ سزا دوبارہ اس سے بڑی شکل میں بھی آ سکتی ہے۔ چوتھے یہ کہ امریکہ بہادر بلوچستان کے ساحل پر نگاہ جما کر بیٹھا ہوا ہے' کیونکہ اسے ایک طرف ایران سے اور دوسری طرف چین سے نمٹنا ہے' اور یہ بات طے ہے کہ ہر ایک سے نمٹنے کے لیے قربانی کا بکرا بہرحال پاکستان ہے' اس لیے کہ آپ کرائے کے فوجی ہیں۔ آپ کو اس نے پہلے روس کے خلاف استعمال کیا' اب چین کے خلاف استعمال کرے گا اور آپ نے استعمال ہونے کا ہی فیصلہ کر رکھا ہے۔ آپ ابھی تک اپنے پاؤں پر کھڑے ہی نہیں ہو سکے اور حال یہ ہے کہ جس منزل کی طرف چلے تھے اس منزل کی طرف پشت کر لی ہے۔ لہٰذا اب آپ کا حشر یہ ہو رہا ہے کہ آپ کے فوجی صومالیہ میں امریکہ کے مقاصد پورے کرتے ہوئے جانیں دے رہے ہیں۔ یہ وہاں جتنے بھی مر جائیں امریکہ کی بلا سے' لیکن امریکی ایک بھی مر جائے تو قیامت آ جائے گی۔ جو خود مرنے کو تیار نہیں ان کے مقاصد پورے کرنے کے لیے جانیں آپ کی جائیں گی۔ امریکہ نے سوویت یونین کے ٹکڑے کروا دیئے اور دس لاکھ افغان مروا دیے۔ اب تک تو اس کا حاصل یہی ہے کہ سارا فائدہ امریکہ کو پہنچا ہے۔ لیکن بہرحال وہاں خلوص و اخلاص کے ساتھ بہت سے لوگوں نے جانیں دی ہیں جس کے' ان شاء اللہ' اچھے نتائج نکلیں گے۔ لیکن اچھے نتائج کے لیے اس راستے پر عمل پیرا ہونا ہو گا جو میں نے آپ کے سامنے قرآن و سنت کی روشنی میں رکھا ہے۔

خاتمۂ کلام

بہرحال میں اللہ تعالیٰ سے دعا کرتا ہوں کہ جو مشقت میں نے آج جھیلی ہے وہ اسے ثمر آور کرے اور شرفِ قبول عطا فرمائے۔ نہ معلوم یہ میری کتنی تقریروں کا حاصل تھا جو آج میں نے ایک گفتگو میں سمیٹ کر اور سمو کر آپ کے سامنے رکھا ہے۔ میں نے کوشش کی ہے کہ آپ کو آپ کے دینی فرائض کا احساس دلا سکوں۔ میں نہیں جانتا کہ میں اس میں کس حد تک کامیاب رہا ہوں۔ اب اصل بات یہ ہے کہ آپ اس پر غور کیجیے' سوچیے کہ آیا یہ چیزیں غلط ہیں یا صحیح ہیں! اگر آپ کا دل و دماغ آج کوئی فیصلہ نہ کر سکے تو اس کے کیسٹ لے لیجیے' انہیں دوبارہ سنئے اور تنقیدی جائزہ لیجیے کہ کہاں استدلال کا جھول ہے' کہاں بات کتاب و سنت کی اصل تعلیمات کے منافی یا متضاد ہے۔ اس پر غور کیجیے اور اگر دل و دماغ گواہی دے کہ یہ سب کچھ کتاب و سنت کے مطابق ہے تو پھر آپ اس تنظیم میں شامل ہوں' قدم بڑھائیں' ہمارے دست و بازو بنیں۔ آج میں وہی پکار لگا رہا ہوں جو حضرت مسیح علیہ السلام نے حواریوں کے سامنے لگائی تھی کہ ﴿مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ﴾ ''کون ہے میرا مددگار اللہ کی راہ میں؟'' اسی صدا پر' اسی ندا پر میں اپنی گفتگو ختم کر رہا ہوں۔

اقول قولی ھٰذا واستغفر اللّٰہ لی ولکم ولسائر المُسلمین والمُسلمات

(مرتب: حافظ خالد محمود خضر)

مرکزی **انجمن خُدّامُ القرآن** لاہور

کے قیام کا مقصد

مَنبعِ ایمان ......اور...... سرچشمۂ یقین

قرآنِ حکیم

کے **علم وحِکمت** کی

وسیع پیمانے......اور......اعلیٰ علمی سطح

پر تشہیر واشاعت ہے

تاکہ امتِ مسلمہ کے فہیم عناصر میں **تجدیدِ ایمان** کی ایک عمومی تحریک برپا ہوجائے

اور اس طرح

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ -اور- غلبۂ دینِ حق کے دَورِ ثانی

کی راہ ہموار ہوسکے

وَمَا النَّصْرُ اِلَّا مِنْ عِنْدِ اللّٰہِ

تنظیمِ اسلامی کا پیغام نظامِ خلافت کا قیام

تنظیمِ اسلامی

مروجہ مفہوم کے اعتبار سے

نہ کوئی سیاسی جماعت نہ مذہبی فرقہ

بلکہ ایک اصولی

اسلامی انقلابی جماعت

ہے جو اولاً پاکستان اور بالآخر ساری دنیا میں

دینِ حق

یعنی اسلام کو غالب یا بالفاظ دیگر

نظامِ خلافت

کو قائم کرنے کیلئے کوشاں ہے!

امیر: **حافظ عاکف سعید**